(۱)

سلسلۂ گلستان

حکایات و احساسات

(یعنی مختصر افسانوں اور مضامین کا دوسرا مجموعہ)

از

سید سجاد حیدر صاحب بی اے

رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مصنف خیالستان و مترجم جلال الدین خوارزم شاہ وغیرہ

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوئی

اول ایک ہزار جلد

قیمت فی جلد [illegible]

(۱۱)

تصانیف سید سجاد حیدر صاحب بی اے

خیالستان

(مختصر افسانوں اور مضامین کا مجموعہ)

مشہور اخبار زمیندار اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے:-

"دارالاشاعت پنجاب نے اردو پر بہت ہی بڑا احسان کیا ہے کہ ادیب جلیل سید سجاد حیدر صاحب کی مشہور و مستغنی عن التحسین کتاب خیالستان کا دوسرا ایڈیشن شاندار ساز و سامان کے ساتھ چھاپ دیا۔ ۔ ۔ ۔ ہمارا ذاتی عقیدہ ہے کہ اردو زبان کی ادبیات لطیفہ میں خیالستان سے بہتر کتاب نہیں"۔

اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ہے قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

ثالث بالخیر

"ایک ترکی فسانہ نگار احمد حکمت کے ناول کا ترجمہ ہے جو ملک کے مشہور ادیب سید سجاد حیدر صاحب نے کیا ہے۔ ترکی فسانوں کی لطافت و نزاکت تمام دنیا میں مشہور ہے۔ ترکوں نے ادبیات لطیفہ کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ یہ ناول اگرچہ چھوٹا ہے مگر جذبات لطیفہ کے لئے اپنے اندر بہت سامان رکھتا ہے"۔ (اقتباس از اخبار زمیندار) قیمت ۔ ۔ ۔ ۸ر (طبع ثانی)

فہرست مضامین

حکایات

صفحہ

احساسات

صفحہ

نوٹ

افسانہائے عشق، گمنام خطوط، بزم رفیقاں، کوسم سلطان، مادر وطن ویران صنم خانے، جدید ترکی کی عدیم المثال مصنفہ، اور وطن پرست خالدہ خانم ادیب کی سحر آفریں تخیل کا نتیجہ ہے۔

آئینے کے سامنے، تیتری، ایک مغنیہ سے التجا، عورت کا انتقام داماد کا انتخاب، دوسرے ترکی مصنفین سے بہ تصرف لئے گئے ہیں۔ باقی مضامین طبع زاد ہیں۔

یہ تمام مضامین مختلف رسالوں (ہمایوں، علی گڑھ میگزین، مخزن وغیرہ) میں شائع ہو چکے ہیں۔

سجاد

حکایات

آئینے کے سامنے

آج صبح نہایت سویرے جب اُس نے دیکھا کہ اُس کا خاوند چپکے سے اُٹھ کے اُس کو جگائے بغیر اور اُس کی مدد بغیر کپڑے پہن کے باہر چلا گیا ہی تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُس کا دل پس گیا۔ اُس کی ساری رات ایک عصبی بحران میں گزری تھی لیکن اب وہ ایک دفعہ تیزی سے اُٹھی، اصیل کو آواز دی۔ اتنے وہ آئے آئے ایک ذہن کو زیر و زبر کرنے والے سوچ میں پڑ کر کمرے ہی میں مضطرب حالت میں اِدھر اُدھر ٹہلی۔

اصیل کے آتے ہی اُس سے پوچھنے لگی: "کیا وہ باہر گئے؟"

وہ جا چکے تھے۔ انھیں گئے ہوئے ایک گھنٹہ سے زیادہ ہو چکا تھا۔

یہ معلوم کرکے وہ بالکل وہم میں پڑ گئی! کیا وہ اُس سے ناراض ہو گیا تھا؟ اس اندیشہ سے اُس کا دل ایک دم کھٹ کرکے دھڑکا اور اپنے میں کھڑے رہنے کی قوت نہ پاکر وہ ایک آرام کرسی میں گر پڑی، تمام رات چادر میں منھ لپیٹے جن آنسوؤں کو وہ روکے رہی تھی بحران کے اس دقیقہ میں جب کہ طغیان گریہ آ تھا تو اُس نے انھیں بہنے کی خوب اجازت دی اور پھوٹ پھوٹ کے روئی۔

اے میرے خدا، یہ اس طرح کیسے گزرے گی؟ اس زندگی کو جو ہر دن اُسے تھوڑی سی مسموم کر جاتی، آہستہ آہستہ خراب کر جاتی تھی کیسے برداشت کرے گی؟ رشک کی یہ کیفیت بھی شاید اپنے خاوند کے حق میں ضرورت سے زیادہ بے انصافی تھی مگر یہ اُس کے اختیار کی بات نہ تھی، وہ اسے اب تک ابتدا کی حرارتِ محبت کے ساتھ چاہتی تھی اور وہ اس تمام محبت کو، عورت کے دل کو لبریز کرنے والے حیاتِ مقدس کو پاؤں تلے روند رہا تھا، کسی دوسری کو چاہ رہا تھا۔ ایک مہینے سے اس سے واقف تھی۔ اُس وقت سے دل شکن شبہات اُسے خراب کر رہے تھے لیکن کل جب کہ وہ اپنے خاوند کی میز کے کاغذات درست کر رہی تھی اُسے ایک خط کے مسودہ نے جو بلا شبہ بھولے سے پھاڑا نہیں گیا تھا، ہر ایک بات جتلا دی تھی اور اب یہ شبہات ایک منٹ میں درجۂ یقین کو

پہنچ گئے تھے۔ اس کا خاوند ایک تیم کو چاہ رہا تھا، یہ بات اب متحقق تھی کہ اس کا خاوند اس کے حق میں خیانت کر رہا تھا یہ پوری طور پر ثابت تھا لیکن وہ اس کی بے وفائیوں، اس کی خیانتوں کے باوجود اسے چاہتی تھی۔

یہ سوچ کر وہ خود اپنے اوپر غصہ ہوتی اور اس حسن پر جس نے اُسے اس درجہ مغلوب کر رکھا تھا لعنت بھیج کر وہ کہتی "لیکن یہ محبت نہیں ذلت ہے!"

اس کے بعد ایک فیصلہ کرتی، اگر یہ حالت قائم رہی تو وہ اس کے ساتھ زندگی بسر نہ کرے گی اور اس سے اس طرح قطع علاقہ کرے گی کہ پھر اس کے پاس نہ آئے گی۔ ہاں، ضرور علیحدہ ہو جائے گی؛ یہاں اس کا ذہن ایک سکنڈ کے لئے ٹھیرا اس کے بعد اس نے اس فیصلہ کے طریقۂ اجرا پر غور کیا، جب کہ وہ کسی دوسری کو چاہ رہا تھا تو کیا وہ اس سے یہ کہے گی کہ مجھے چھوڑ دو؟ اور اس خیال نے آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں اپنی پوری تاثیر سے بڑھنا اور کسب اہمیت کرنا شروع کیا۔ لیکن اسی دقیقہ میں اس نے ذہناً اپنے تئیں متروک دیکھا اور وہ کانپی، اس کے دماغ میں یہ نقشہ کھنچا کہ اس سے آزاد ہو کر خاوند سیدھا اپنی محبوبہ کی آغوش میں گرنے کے لئے جا رہا ہے۔

آہ! اس وقت وہ کیا کرے گی؟ کیا اپنے ہاتھوں اس تمام سامان کو جو

اس قدر رشک کا باعث تھا پیدا نہیں کرے گی ؟ اسے سوچ کر خود ہی نادم ہوئی اور پھر ان تمام سیاہ حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے کوشش کرنی اور یہ یقین کرنا چاہتی کہ اگر اس سے جدا ہوئی تو زندہ نہ رہ سکے گی ۔

اس کا خیال بھی اسے خوف زدہ کر دیتا تھا تو کیا یہ حالت یوں ہی رہے گی اور وہ اپنے حق کی مدافعت میں ایک ناتوان آواز بھی نہ نکال سکے گی ؟ ۔ ۔ ۔ اس لمحہ میں اس نے اپنے تئیں اس قدر حقیر و ذلیل پایا کہ اس کی روح کی گہرائیوں میں سے وقارِ نسوانی کا ایک سیلاب جوش مارنے لگا اور اس نے پھر مقابلہ کا ارادہ کیا لیکن ایک سکنڈ میں اس مقہوریت کے ساتھ جو اس کی تمام معنوی قوتوں کو توڑ رہی تھی اس نے پھر حقیقت کی طرف عود کیا۔ کیا فائدہ جب کہ وہ اسے اس درجہ چاہتی تھی ۔

اس کے بعد اس نے ان اسباب پر غور کرنا شروع کیا جن کی بنا پر وہ اس طرح سویرے اسے خبر کئے بغیر چلا گیا تھا۔ کیا حقیقت میں وہ اس سے ناراض ہو گیا تھا ؟ اس احتمال نے اسے اتنا ڈرایا کہ ابھی ذرا سی دیر قبل کے تفکرات و تفقرات پر خود ہی نادم ہونے لگی اور یہ خیال کر کے کہ وہ ذہناً حد سے کچھ آگے بڑھ گئی تھی گھبرانے لگی، ممکن ہے کہ یہ خط سوائے اس کے کچھ اور

نہ تھا کہ ایک دوست کے نام ایک کاغذ ہو۔ اب اپنے ظنیات اور اپنے خاوند کے
بیانات کے درمیان مطابقت کا پہلو ڈھونڈنے لگی اور ان دو شقوں میں سے
کہ اس کے شبہات اپنے خاوند کے متعلق پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہوں۔ یہ کہ وہ اپنے
خاوند کے خلاف ناانصافی کی متہم ہو۔ دوسری شق کو آسان سمجھتی تھی، لیکن بات یہی
ایک شبہ ان تاویلات کی کمر توڑ دیتا اور ہر محاکمہ کو درہم برہم کر دیتا۔ یہ مانا کہ یہ عورت
اس کی دوست تھی اور اس کے کسی دوست کی بیوی تھی مگر اس کا کیا جواب کہ
وہ اسے "ڈارلنگ" سے خطاب کر رہا تھا، اسے بھی چھوڑیئے۔ اس کا کیا جواب
کہ پنہاں طور پر اک موعد ملاقات مقرر کیا جا رہا تھا۔ اس نکتہ کو اس سے پہلے
کیوں اس نے خیال نہیں کیا تھا، بس اب معلوم ہو گیا کہ اس معاملہ میں جو کچھ
عذرات اور تاویلات وہ پیش کیا کرتا وہ سب جھوٹ تھے اور کون کہہ سکتا ہے
کہ اس طرح سویرے اٹھ کے بھاگ کر جانا اس خیانت کی اک برہان صریح نہ تھا
شاید کہ اس لمحہ میں وہ اس عورت کے آغوش میں تھا، اپنے تصورات کو
اس نے ذرا اور آگے بڑھایا اور یہ سوچا کہ شاید اس وقت وہ اس عورت
کے سامنے اپنی بیوی کی بدگمانی رشک، تنگ فراجی کی دل کھول کر شکایت
کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ "بس اب مجھ سے یہ سہی نہیں جا سکتیں" تو کیا ان

باتوں سے واقف ہوکربھی وہ کوئی آواز نہ نکال سکے گی اور اس سے ہی کہا جائے گا" اپنے خاوند کے ساتھ ناانصافی کرتی ہو حد سے آگے بڑھ رہی ہو" وہ کب حق پر تھی؟ حیاتِ ازدواج کے شروع کے زمانہ سے لے کر اب تک تمام لڑائیوں اور اختلافات میں کیا ہمیشہ وہ مغلوب نہیں رہی تھی؟ یہ خیال اُسے متاثر کرتا ہے اور اپنے آس پاس ایک بھی قلبِ مشفق نہ پاکر جو اُس کے ساتھ ہمدردی کرے وہ ایک الیم بیکسی کا احساس کرتی تھی، اب تک کسی سے اُس نے اپنے اس حال کا ذکر نہیں کیا تھا اور ہمیشہ خوش و خرم نظر آنے کی کوشش کی تھی، حال آنکہ کس قدر بدبخت تھی!

اب اس بدبختی کی تلخی کو زیادہ وضاحت سے محسوس کررہی تھی اور یہ سوچ سوچ کر کہ ابتدائی ایام کی خوشیاں پھر عود نہ کریں گی مایوس ہوتی تھی، آہ! اُس وقت کیسا ایک دوسرے کو چاہتے تھے! لیکن اب اُس بیوی سے جس کی ایک زمانہ میں پرستش کی جاتی تھی بھاگا جاتا ہے، یہاں تک کہ اُس کی بدگمانیاں بھی جس میں وہ بالکل حق بجانب تھی سہی نہ جاتی تھیں تو گویا اُس کے بعد یہ سلسلہ یوں ہی رہے گا، زندگی ان میاں بیوی کے لیے ایک ناقابلِ برداشت عذاب، ایک دائمی مجادلہ کے ساتھ اُٹھایا ہوا بوجھ ہوگی۔ لیکن کیا زندگی ان

زحمتوں کی ارزش رکھتی تھی؟ وہ سوچتی تھی تو بجائے اُن آرزوں اور اشتیاقوں کے جو انسانوں میں جینے کے لئے پیدا ہوتے ہیں اپنے میں ایک ناامیدی کا احساس کرتی تھی جو بڑھتی ہی جاتی تھی، ہاں اب وہ کچھ بھی کرے، اس ماضی کا اعادہ جو ہر قدم پر دور ہوتی جا رہی تھی ممکن نہ تھا، وہ سوچتی تھی کہ حقیر ہو کر زندہ رہنے میں کیا لطف ہے؟ دیکھ رہی تھی کہ اس کا خاوند اب اُسے نہیں چاہتا۔ اس کے ساتھ خوش نہیں رہتا۔ ایک مدت سے اس سے واقف تھی لیکن یہ خیال نہ کرتی تھی کہ وہ اس کے حق میں بے وفائی کرے گا اس غم کے بعد کیسا بدبخت تھی۔

یہ سوچ کے کہ اگر ان خیالات میں اور زیادہ گھری گئی تو اس کی حالت خراب ہو جائے گی وہ اُٹھی، کمرے ہی میں تھوڑی دیر ٹہلی اور پھر غسل خانے میں جا کر نہایت ٹھنڈے پانی سے مُنھ دھویا، دھویا کیا مُنھ پر چھینٹے مارے پھر آ کر کمرے کی کھڑکی کھولی۔

اب کھڑکی کے پردے کو ہلاتی ہوئی، کوچ کی جھالر کو جنبش دیتی ہوئی بادِ صبا کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے لمبے لمبے سانس لے کر اپنے جگر کو بھرنا شروع کیا اس صاف ہوا کے کھانے سے اُسے ایک شگفتگی معلوم ہوئی

اور اس کے اعصاب میں سکون آیا۔ تھوڑی دیر کھڑکی کے پاس اسی طرح
ٹھہری، اس کے پلنگ کے پاس آکر اس نے اپنی جورابیں پہنیں، کمرہ ایسی گڑبڑ
حالت میں تھا کہ اس سے اس کی طبیعت میں بہت الجھن پیدا ہوئی۔ کوچ کے پاس
کل شام کی چائے کی چھوٹی میز مع چائے کے سامان کے رکھی ہوئی تھی جس کے
اٹھانے کا وقت نہ ملا تھا۔ پیالیاں میلی تھیں، پلیٹوں میں کچھ بسکٹ، کچھ میوہ،
کچھ کھایا کچھ بکھرا ہوا پڑا تھا، کوچ پر کچھ کتابیں پڑی تھیں، کچھ اخبارات
بکھرے ہوئے تھے، الماریوں میں کتابوں کی خالی جگہ انھیں زبانِ حال سے
بلا رہی تھی۔ اخبارات اور رسالے ترتیب کے طالب تھے جنھیں اس کے خاوند
نے جھنجھلاہٹ میں پڑھا تھا اور کسی رسالہ کے ورق انگلی ہی سے اس طرح
بے پروائی سے کاٹے تھے کہ صفحوں کے متن کٹ گئے تھے۔ جلی ہوئی دیا سلائیاں
ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں، سگرٹ کی خالی ڈبیاں لڑک رہی تھیں، ادھر
ایک واسکٹ پڑی تھی تو ادھر خاوند کے شب خوابی کے کپڑے پڑے تھے
کرسیاں اپنی جگہ سے ہٹی پڑی تھیں ایک کالر فرش پر گرا پڑا تھا، میز پر
تولیا، بنڈل بنی ہوئی پڑی تھی، ان چھوٹی چھوٹی چیزوں نے ادھر ادھر
پڑ کر کمرے کو عجب غیر منتظم حالت میں ڈال رکھا تھا اور یہ حالت اس کی

طبیعت میں اُلجھن پیدا کرتی تھی، وہ فطرتاً نفاست پسند اور منتظم واقع ہوئی تھی۔

اُس کا شوہر بے پروا اور غیر منتظم تھا اور اس معاملہ میں شوہر کو اکثر اپنی بیوی کی گھڑکیاں سہنی پڑتیں، وہ جہاں بیٹھتا جلی ہوئی دیا سلائیوں اور آدھے استعمال کئے ہوئے سگرٹوں کے ڈھیر فرش پر لگا دیتا، حالانکہ اُس کے سامنے راکھ دانی رکھی ہوتی، وہ اسے انتظام سکھانا چاہتی۔ مگر اُس کا پھوہڑ پن نہ جاتا۔ غرض کہ آج بھی اُس نے تھوڑی دیر کمرے کی اس حالِ پریشاں کو دیکھا کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہ تھی، پھر جھنجھلا کے اُٹھی۔ پہلے چائے کی میز کو ایک طرف رکھا، کرسیوں کو ٹھیک کیا، کتابوں اور رسالوں کو جمع کیا، اصیل کو بلا کے چائے کی کشتی اُٹھوائی، غسل خانے میں لوٹوں میں پانی بھر کے رکھنے کو کہا۔ چھوٹی چھوٹی بکھری ہوئی چیزوں کو اُٹھایا، الماری کو بند کیا، سب سے زیادہ بُری اُسے قالین پر پڑی ہوئی دیا سلائیاں اور سگرٹ کے خالی ڈبے معلوم ہوتے تھے، ایک ایک کرکے اُنھیں جمع کرتی جاتی ہے اور غصہ ہوتی جاتی ہے، ان چیزوں کو اُٹھا لینے کے بعد کمرے میں تھوڑی سی صفائی پیدا ہوئی تو اُس نے ایک لمبا سانس فراغت کا لیا اور پھر کھڑے ہوکر کمرے پر

نظر دوڑائی کہ کن کن چیزوں کو ٹھیک کرنے کی اور ضرورت ہے۔

آج ہی وہ ایسا نہیں کر رہی تھی اُس کی یہ عادت تھی، صبح کو اُٹھتے ہی سب سے پہلے اپنے کمرے کے چھوٹے چھوٹے کام کرتی، بستر درست کرتی غسل خانہ میں جاکر دیکھتی کہ وضو کا پانی تیار ہے، کھڑکیاں کھولتی، میزوں کو صاف کرتی، سنگار میز کے آئینہ کو پونچھتی، کپڑوں کی الماریوں کا معائنہ کرتی اور ان تمام مشاغل میں جس سے ہر گھر کی بیوی تھوڑی بہت دلچسپی رکھتی ہے اُسے بہت بڑی لذت حاصل ہوتی، یہ عادت سالہا سال سے بلکہ بیاہ کے ابتدائی زمانہ سے لے کر عادت نہیں رہی تھی بلکہ اس نے ایک اٹل قانون کی شکل اختیار کرلی تھی جس کے اجرا میں کسی حالت میں بھی التوا جائز نہ تھا۔

اُس کے خیال میں گھر کی بیوی کے متعلق چند خدمتیں تھیں جنھیں کسی دوسرے کو سپرد کرنے سے بڑھ کر موجب عار کوئی اور سستی اور بے پروائی نہیں ہو سکتی تھی، گھر کی زندگی کے متعلق تمام فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنا وہ اپنے اوپر لازم سمجھتی تھی اور اس معاملہ میں وہ اس درجہ پکی اور عزم پرور تھی کہ اُسے یاد نہیں آتا تھا کہ وہ ایک دن بھی اپنے مقررہ قاعدہ کے خلاف گئی ہو۔ یہاں تک کہ جن خدمتوں کو اُس نے اپنے اوپر عاید کر رکھا

تھا۔ اُن میں کسی اور کی تھوڑی سی شرکت یا معاونت کو بھی وہ اپنے حق میں ایک تجاوز خیال کرتی تھی اور بجائے ممنون ہونے کے اُس سے جلتی تھی، ہاں ہر چیز میں اپنے خاوند اپنے گھر اپنی محرمیت حتیٰ کہ چھوٹے سے چھوٹے کام میں جو اُس سے متعلق ہوتا وہ دوسرے کی شرکت سے رشک کرتی۔ اس رشک نے سالہا سال سے اُس میں مفرط عصبیت کی وجہ سے ایک ایسا احساس مریضانہ پیدا کر دیا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتی اور تنک مزاج عورت بن جاتی۔

اُس کا سب سے زیادہ محرم گوشہ اُس کا کمرہ تھا۔ اُس میں ایک منٹ کے لئے بھی کسی نامحرم کے سائے کے بھی داخل ہونے کی روادار نہ تھی، داخل ہونا تو علیحدہ رہا اُس میں کسی کا باہر سے نظر ڈالنا بھی اُسے گوارا نہ تھا اس کے کمرے کی کل چیزیں گویا اس کی محرم راز تھیں اور وہ اُن میں سے ہر ایک کی عزت کرتی تھی اور حیاتِ ازدواج کی چھوٹی سی چھوٹی یادگار کو بھی قابلِ پرستش سمجھتی تھی، وہ خیال کرتی تھی کہ یہاں اس حریمِ اسرار میں جو عصمت مآب محبت انتساب یادگاروں سے بھرا ہوا تھا اگر کسی غیر کی نظر پڑی تو وہ یادگار اُسے بھی معلوم ہو جائے گی اور وہ کونے جنہیں مکتوم رہنا چاہئے کشف ہو جائیں گے اور وہ صمیمیت جواب وہاں دائر و

سائرہ اُس وقت وہاں نہ رہے گی، اسے سوچتے سوچتے اُس کی یہ حالت ہو جاتی کہ دل میں ایک اندیشہ پیدا ہوتا کہ کہیں کسی کی نظر نہ داخل ہو گئی ہو اور وہ خواہ مخواہ دروازے کو بند کر دیتی، رات کو سونے کے وقت اس کمرے کا خود ہی دروازہ کھولتی، خود ہی لیمپ جلاتی اور اس وقت اُسے اطمینان ہوتا کہ وہ کسی غیر جگہ میں نہیں ہے۔ اُس کے عورت پن کا یہ ایک عجیب حس تھا کہ اس کمرے سے باہر جس میں حیات ازدواج کی پہلی رات اُس نے بسر کی تھی اس کے قلب میں ایک اجنبیت، ایک غیر محرمیت کا احساس پیدا ہوتا اس وقت یہاں اس کمرے میں ان چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول تھی۔ ایک چھوٹی سی چیز نے جس کی طرف کبھی اُس کا خیال بھی نہ گیا تھا، ایک یادِ بعید اُس کے دل میں پیدا کر دی اس یاد کو زندہ کرتے وقت جو ایک رجعتِ فکر یہ کے ساتھ سیدھی بیس سال پہلے کی ابتدائی پُرلطف ماضی کی طرف لے گئی۔ اپنے لڑکپن کی ایک حکایت محبت کے تمام صفحات شعر و معاشقات اس کی نظر کے سامنے آ گئے۔ اس وقت شاید وہ چودہ برس کی تھی، گرمیوں کی چاندنی رات تھی، وہ دونوں (یا زیادہ صحیح یہ کہ خود وہ گجروں اور پھولوں میں لدی پھندی) چھت پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھے ہوئے تھے کہ اس نے یکایک اس سے پوچھا:

"کیا تم حقیقت میں مجھے بہت چاہتے ہو ؟"

اُس نے اوّل اس سوال کو بچّوں کا سا سمجھا، اس سوال کو سُن کر وہ مسکرایا، لیکن اصرار پر اُس نے اسے یقین دلایا: کہ جتنا وہ سمجھتی تھی اُس سے زیادہ وہ اُسے چاہتا تھا اور تا ابد زوال ناپذیر محبت سے وہ اُسے چاہے گا اور پھر قسم کھا کے کہتا تھا "مرتے دم تک میں تیری پرستش کروں گا"۔

وہ ان تمام نوعات سودا یا نغماتِ الفت کو جو ایک پُر حرارت قلب سے نکل رہے تھے ایک عمیق مسرت کے ساتھ کانوں سے پی رہی تھی، اور اسی لمحہ میں اُس کے چھوٹے سے دماغ میں ایک دوسرا سوال پیدا ہوا جسے اُس نے پوچھا:

"جب میں بڈھی ہو جاؤں گی تب بھی ؟"

اس پر اس نے قسموں کا تار باندھ دیا،

تو کیا یہ سب جھوٹے تھے ؟ زندگی! کیا وہ جھوٹ سے عبارت نہ تھی ؟ اسے جانتی تھی اور پھر بھی دھوکا کھا رہی تھی، اور اس وقت تک دھوکے ہی میں رہی تھی، آہ، انسان اگر فریب خوردۂ آرزو نہ ہو تو یہ بدبخت مخلوق کس طرح تسلی پاتے اور کس طرح جیتے ؟

اس وقت کہ کمرے کی چیزوں کو درست کر رہی تھی ہاتھ میں اک کپڑا تھا کہ آئینہ کے سامنے پہنچی اور اُسے غبار سے صاف کرنے لگی، آئینہ کے مقابل ہوئی تو اُسے خیال آیا کہ وہ اس قدر بڈھی تو نہ تھی، یہی نہیں بلکہ اُس کا لمبا قد، بھرا ہوا سینہ، نشیلی آنکھ، سر پر بکھرے ہوئے سیاہ بال (جن کا ابھی جوڑا نہیں باندھا گیا تھا اور جو گویا سیاہ لہریں تھیں) اُس کا چھوٹا منھ، اُس کی گوری جلد جس کی طراوت ابھی غائب نہیں ہوئی تھی، غرض کہ سب چیزیں ابھی اس قدر حسین تھیں کہ وہ چاہے جانے کے قابل تھی، اس کی نظروں میں ایک ایسا خمار تھا کہ انسان کو مست کر دیتا تھا، اور اس کی سیاہ گھنی اور لمبی پلکوں میں سے نکل کر آنے والی نگاہ ایک ابدی عشق کی مدہوشی پھیلاتی تھی، غرض کہ اس کے عورت پن کی روح، اُس کی تمام رقت اور جاذبیت اُس کی نشیلی آنکھوں کے اعماقِ مدہوشی میں آکر جمع ہو گئی تھی، جسے دیکھتے دیکھتے انسان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ خواب میں کسی سراب میں پیر رہا ہے، وہ سادہ دل تھی اور آئینہ سا اور چہرے پر ایسی تازگی تھی اور اُس کے حسن میں ایک ایسا رقیق جاذبہ سحر تھا کہ انسان کو اُسے بیس سال سے زیادہ کا خیال کرنے میں تردد تھا۔

وہ اس قدر جوان شکل اور خوبصورت تھی، پھر بھی اُس کا خاوند اس کے

ساتھ خیانت کر رہا تھا' ایک دوسری کو چاہ رہا تھا' گھر کی پاکیزگی سے نکل کر ایک سفیہ عورت کی آغوش لوٹ و رہا ہیں خوشی تلاش کرنے کے لئے انسان کو کس قدر احمق ہونا چاہیئے ؟ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اس کے بعد اس کے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہوا : شاید وہ عورت اس سے زیادہ خوبصورت تھی' اس وقت اس کے چہرے کا عکس جو آئنہ میں پڑ رہا تھا اُسے ایسا معلوم ہوا کہ آسے ایک مستھزی نظر سے دیکھ کر کہہ رہا ہے : ہاں وہ تجھ سے زیادہ خوبصورت اور تجھ سے زیادہ جوان ہے' اِس سے اُس کے دل میں ایک زخم لگا اور وہ سوچنے لگی کہ اس کا خاوند اس عورت کی کسی تاثیر جاذب کے زیر حکم و نفوذ ہوگا اور اس خیال سے اس عورت کے خلاف جس نے اس کے خاوند کو اس کے ہاتھ سے چھین لیا اس کے دل میں اک گہری خصومت پیدا ہو رہی تھی' اگر ممکن ہوتا تو وہ جاتی اور اُسے اس کے بالوں سے پکڑ کر کھینچتی اور اس دشمن کو جس نے اس کی تمام خوشیوں کو زہر آلود کر دیا تھا سانپ کے سر کی طرح کچل دیتی ۔

اب اُس کا قلب زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ تصورات کا شکار ہو رہی تھی کہ ایک اور خیال نے اُسے مایوس کیا' اُس کا خاوند' اُس عورت کو

معلوم نہیں کیسی دیوانہ وار محبت سے چاہتا ہوگا اور یہ سوچتے سوچتے اُسے ضعف محسوس ہوتا یہاں تک کہ وہ سوچنے سے بھی عاجز ہو جاتی، آہ! یہ عورت کیسی جادو بھری قوت کی مالک تھی کہ ایک مرد کو اُس کے تمام علاقوں سے جدا کرکے اپنے قبضہ میں لاسکتی تھی، ضبط کرسکتی تھی، حیاتِ ازدواج میں تو اُسے ایک دن بھی یاد نہیں پڑتا جب کہ وہ خاوند پہ تحکم کرسکی ہو، اپنی حیاتِ معاشقہ میں بھی وہ کبھی اتنی سحار نہ تھی لیکن خود وہ اُسے ہمیشہ دیوانہ وار چاہتی رہی تھی، اس سے اُس نے ایک نظریہ قائم کیا:-

"یقیناً وہ عورت اُسے نہیں چاہتی؟

کیونکہ دیکھ رہی تھی کہ چاہنے والا چاہا نہیں جاتا اور اس بنا پر تمام نوع انسان پر تہمت لاکر انھیں قابلِ مواخذہ خیال کرتی تھی، اس کے بعد اس کا فکر ایک دوسری جانب منتقل ہوا: شاید یہ عورت خوبصورت بھی نہ تھی آئینہ میں اپنی صورت ایک نکتہ چیں کی نظر سے دیکھتی ہے اور یہ خیال قوت پکڑتا ہے، اپنے تئیں اس سے زیادہ خوبصورت ثابت کرنے کے لئے اپنے ذہن میں اپنا اور اُس کا مقابلہ کرتی ہے اور اس عورت کو گھٹانے کے لئے عجیب عجیب نقطے پیدا کرتی ہے۔

اپنے تئیں آپ پر ترجیح دینے کے کتنے جہات باقی ہیں کہ اس کا غرور نسوانی جوش میں آتا ہے اور وہ اتنا کہنے کی لپٹ میں قوت حاصل کر لیتی ہے کہ "آپ اچھی شکل پہچاننے کی تمیز ہی نہیں"۔ اس میں علاوہ اس کے کہ وہ خوبصورت تھی ایک دوسری ممتازیت بھی تھی کہ اس ممتازیتِ عفیفانہ کے مقابل میں باقی تمام چیزیں قابلِ سقوط تھیں۔ پھر اپنے خاوند کو اپنے حسن اور اپنی عفت کے ساتھ اپنی روح، اپنے عورت پن کی سب سے زیادہ پاک، سب سے زیادہ صاف ہستی کو دے چکی تھی اور اس سے کوئی شخص اس قدر مربوط نہیں ہو سکتا تھا مگر افسوس اس کی قدر نہیں کی جاتی تھی، تو گویا یہ سب خیال بے فائدہ، تمام رائیگاں تھیں!

اس کی حیاتِ ازدواج کا یہ نتیجہ مقدرہ اس کے ذہن کے سامنے آتا ہے وہ متاثر ہوتی ہے اور آئینہ میں اپنے عکس کو دیکھ کر اپنے اوپر ترس کھاتی ہے، یکایک اپنے سر کے بالوں میں ایک سفید تار اسے نظر پڑا، اور اس اوّل نشانۂ خرابی نے اس کے دل کو مسوسا، اسے وہاں سے اکھاڑتے وقت اُس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں، اس کے بعد دو ایک سفید تار اور جو نظر آئے تو اس کے دل میں ایک حقیقتاً المناک کے متعلق ایک ایسا یقین مایوسانہ پیدا ہوا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تو یوں کہئے کہ وہ بڈھی ہو رہی تھی، اس کے بعد روز بروز وہ بوڑھی ہوتی جائے گی اور جوں جوں سفید بال زیادہ ہوتے جائیں گے وہ اس گڑھے کے ایک قدم اور نزدیک ہوتی جائے گی، زندگی کے ایامِ مسرت اب گویا روز بروز دور ہوتے جائیں گے اور وہ اپنی جوانی کا جو غائب ہوتی جا رہی تھی ماتم کیا کرے گی۔ زندگی کی تمام امیدیں اس کے لئے بے معنی الفاظ تھیں، اس کا خاوند اب اُسے نہ چاہے گا اور روز بروز اس بڑھیا بیوی سے دور ہوتا جائے گا، اور اس میں وہ حق بجانب بھی ہوگا، اس لمحہ میں اپنی عیش کی تمام یاس و بیچارگی کے ساتھ اس نے قضا و قدر کے اس تلخ جلوہ کے سامنے اپنی گردن جھکا دی اور اپنی بدبختی پر خود ہی رحم کھانے لگی۔

لیکن وہ پھر بھی سالہا سال سے ان سمتوں میں بسی جانے کے باوجود تازہ و شگفتہ تھی، آئینہ میں اپنے چہرہ پر جو سالہائے دراز کے قہر و الم اٹھا کر بھی اپنی دل بری قائم کئے ہوئے تھا نظر ڈالتے وقت اُسے ایسی دل کشی کی علامتیں نظر آئیں جس سے وہ اپنے خاوند کو اس تغافل میں قابلِ الزام قرار دے سکتی تھی اور اس سے ایک بڑا اطمینان اُسے حاصل ہوا،

وہ اس میں مشغول تھی کہ اُس کی لڑکی کی لطیف و پرنشہ آواز

نے اچانک اُسے گویا ایک خواب سے بیدار کیا - اس آواز نے اُسے
اُس کابوس سے جو اُس کی مجادلات روحیہ میں اس کے قلب کو گھونٹ رہا
تھا چھڑایا اور اُس نے ایک لمبا سانس لیا - لڑکی نے آج کپڑے
بدلے تھے - اور اس کی خوشی میں وہ دوڑی دوڑی آئی اور گو
چودہ برس کی تھی مگر بچپن کی ورآغوش طفلانہ سے اپنی ماں کو
لپٹ گئی -

ایک ایسے استفسار سے جس میں یہ یقین شامل تھا کہ اس کی آرزو فوراً
پوری کی جائے گی اُس نے کہا "اماں جان، چلئے پائین باغ میں جھولا جھولیں"
"بیٹی مجھے تو کام ہے" وہ اس پر ٹھنکنے لگی : اس پر اُس نے اپنے
اعتقاد قدیم کے خلاف نئے موسم کے ساتھ جھولنے کی اجازت
دی -

لڑکی جس وقت کمرے سے نکلی تو ماں کے دل میں ایک حسرت پیدا
ہوئی - کاش وہ بھی اسی طرح چونچال زندگی کے تمام تاثرات آلام کے
مقابلہ میں بے پرواہ لڑکی ہوتی - یہ لڑکی ! وہ اس فلاکت سے بھی بے خبر

تھی جو اس گھر میں طاری و ساری تھی۔

ہنستی ہے۔ ٹھنکتی پھرتی ہے اور اس کی ماں، بیوی بچے چھوڑ دینے والے خاوند کی وجہ سے آنسو بہا رہی ہے۔ وہ ہر چیز سے بے پروا بے خبر نہ معلوم کس ہوائی آرزو کے تعاقب میں پھر رہی ہے۔ جب وہ نوجوان لڑکی تھی تو کیا خود وہ ایسی ہی نہ تھی؟ اُس وقت اس کی آنکھوں میں وہ زمانہ پھر گیا جب بیاہ ہونے تک وہ ماں باپ کے مہر آمیز تقیدات میں، ہر قسم کے فکر و اندیشہ سے آزاد، کنوارپن کی آرام بھری زندگی بسر کرتی تھی۔ وہ لڑکی جس پر تمام گھر بھر نثار ہوتا تھا آج چاردہ سالہ لڑکی کی ماں بن کر ایک بدبخت متروک بیوی ہے جو غم و غصہ سے سوکھ گئی ہے اور بال سفید ہو گئے ہیں۔ اور اس خوشی کی جس کی قیمت اس وقت نہ جانی، یاد بعید سے اس وقت محزون ہو رہی تھی۔ آہ اس وقت اُس نے بیاہ کی کیسی تمنائیں کی تھیں اور بیاہ کی زندگی سے کیا کیا امیدیں کی تھیں۔ اب وہ تمام امیدیں خالی ہو جانے پر، اپنے دل سے کہنے لگی:۔

"آہ! میں کس قدر دھوکے میں تھی"۔

اور اس زندگی کی جس کی حقارت کی تھی، اس وقت وہ تقدیس کر رہی تھی۔ کاش اگر وہ زندگی پھر مل سکتی تو اس کے واسطے ہر چیز فدا کرنے کے لئے تیار تھی۔ اب پھر اس کا خیال اپنی بیٹی کی طرف گیا۔ اس خوف سے کہ کہیں اس کی بھی قیمت اس کی طرح نہ ہو کانپ اٹھی اور اس کا ارادہ ہوا کہ فوراً جائے اور .... اپنے دل کا درد اُسے سنائے اور ممکن ہو تو اُسے آئندہ کے متعلق خبردار کرے۔ مگر کیا فائدہ؛ وہ بھی اسی کی طرح، تمام نوجوان لڑکیوں کی طرح، وہی خواب دیکھ رہی ہوگی۔

دُلہن ننھا! یہی پری خیال تمام نوجوان لڑکیوں کے خوابوں میں آتی ہے۔ کیا خود اُسے، ایسی پری نے کنوارپن میں مسخر نہیں کر لیا تھا؟ کاش اُسے خبر ہوتی کہ جن خوشیوں کو انسان دائمی خیال کرتے ہیں اُن میں اتنی مدت بھی ایک حظ غفلت حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ ایک سراب سے جو خواب میں دیکھا جائے حاصل ہوتا ہے۔ مگر اصل حماقت، زندگی میں کسی دائمی خوشی کے موجود ہونے کا یقین کرنا ہے۔ اسے اب

سمجھتی تھی بلکہ ابتدا ہی میں سمجھنے لگی تھی ۔ بے شبہ تمام نوجوان لڑکیوں کو بھی یہ علم ہو کر رہیگا ۔ لیکن کس وقت ؟ جب کہ ہر چیز ختم ہو چکی ہو گی اور زندگی کے ہر قسم کے نیک و بد احتمالات کے مقابلہ میں سوائے سر تسلیم خم کرنے کے اور کوئی چارہ نہ ہوگا ۔ ایک وقت اس سے بھی یہی لوگوں نے کہا تھا ۔ مگر اس وقت کون یقین کرتا تھا ؟ اسے سوچ کر ایک آہ کھینچ کر کہتی ہے :-

" آہ ! کم عمری ! " لیکن کیا تمام بیاہی زندگیاں ایسی ہی تھیں ؟ بے شبہ زیادہ تر خوش زندگیاں تھیں مگر جب اس کے نصیب ہی میں یہ نہ ہوا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ سوچ رہی تھی کہ باغ سے آتی ہوئی لڑکی کی آواز سُنی ۔ اس وقت اُس کے دل میں اس کے دیکھنے کی احتیاج پیدا ہوئی اور وہ کھڑکی کی طرف دوڑی اور دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی ۔ اس کے لطیف و دلکش قد نے اس لڑکی میں جس نے ابھی عمر کے چودہ سال بھی پورے نہیں کئے تھے ایک ایسی پُر محبت و پُر امل نوجوان لڑکی کی کیفیت پیدا

کردی تھی کہ اُسے دیکھ کر ماں کے دل میں ایک شیریں حسِ افتخار
پیدا ہوا اور یہ خیال کر کے وہ مطمئن ہوئی کہ جس ماں نے ایسی جوان
اور خوبصورت لڑکی پائی اس کا خوش قسمتی میں ضرور تھوڑا سا
حصہ ہے۔ اس کے سوا اس کی اور کیا تسلی تھی؟ اُسے زندگی سے
مربوط کرنے والی اور ان تمام مایوسیوں اور بے بسیوں میں اُسے زندگی
پر مائل کرنے والی اس کی لڑکی ہی تو تھی، اگر کہیں وہ بھی نہ ہوتی
تو؟ ——

اُس کی آنکھیں لڑکی کا تعاقب کر رہی تھیں کہ اس کا دل ایک حسِ تضرع
سے بھر اُٹھا اور اُس نے منہ پھیر کر اور ہاتھ اٹھا کے اپنی بیٹی کی
زندگی کی خوشی کے لئے دعا مانگی۔ پھر اس کے سینہ میں ایک آہ خزاں
پیدا ہوئی اور وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ یہ چند گھنٹے کی حیات تعب و
اضطراب اس پر اپنا اثر کئے بغیر نہ رہی اور وہ ایسی تھکی کہ آج اُس کے
آنے کا بھی انتظار نہ کر سکی اور سو گئی۔

وہ حسبِ معمول بہت دیر کے بعد آیا اور اپنی بیوی کی مدد کے بغیر

کپڑے اُتار کے لیٹ گیا۔ مگر اس کی نیند پریشان تھی۔ خلاف معمول وہ آج بیوی سے پہلے اٹھا اور جس کبیدگی سے سویا تھا اس کبیدگی ہی سے اُٹھا۔ وہ اس دوسری سے لڑکر آیا تھا۔ اس لڑائی نے وہ جادو کا خمار جو اس دوسری کی محبت کا اس کی آنکھوں میں بھرا تھا اُتار دیا۔

بیوی سو رہی تھی، اور اس کے چہرے پر ایک ایسی معصومیت اور مظلومیت کی ادا تھی جو اس گریزاں خاوند کو بھی اپنی طرف کھینچے بغیر نہ رہی۔

اس کی خاموش مگر دائمی محبت، اس کی فتنہ زا مگر موقت اظہار الفت اس کا چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بے زبان اظہار احسان، اس کا طلب زر و طلب تحائف کا نہ تھمنے والا طوفان، اس وقت کہ تمام گھر میں سناٹا تھا، صرف کمرے کی بڑی گھڑی کھٹ کھٹ کرکے جاگنے کا ثبوت دے رہی تھی اور وہ جاگ رہا تھا۔ بیوی کا اور اس کا جس سے لڑکر آیا تھا طرز عمل اپنے اصلی رنگ میں اور اپنی متضاد کیفیت کے ساتھ اس

کی آنکھوں میں پھر رہا تھا کہ اس کی نظر اُس کے بالوں پہ پڑی جو تکیئے پر بکھرے ہوئے تھے اور اُسے چند تار سفید نظر آئے۔

یہ تارہائے سفید! قدرت نے یہ نورانی رسن بھیجی تھی کہ اُسے سیاہیوں میں سے، تاریکیوں میں سے نکال لائے، وہ اپنی رفیقہ کی طرف جس نے اپنا چودھویں برس کا بالپن اور اُس وقت سے ساری زندگی اُس پر نثار کی تھی اور کر رہی تھی، ایک مقاومت پذیر انجذاب سے کھنچا۔ اُس وقت اس کی آنکھ کھُلی تو اُس نے دیکھا کہ وہ ان سفید تاروں کو چوم رہا تھا۔ اور مشرق سے شعاعِ نور کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

نشہ کی پہلی ترنگ

جوان[1]! بیس سال کا جوان ہے۔ وہ گردابِ حیات، تاثراتِ روحانیہ، سرزنشِ وجدان کس کو کہتے ہیں۔ اس سے بالکل بے خبر ہے۔ حظوظِ نفسانیہ میں شدت سے منہمک اور ہوا و ہوس سے مغلوب۔ جہاں بزمِ عیش دیکھی اُدھر ہی دوڑنا۔ کہیں آہنگِ طرب سننا۔ اسی میں شریک ہونا، جہاں معلوم ہوا کہ کوئی مجلس مستانہ ہے وہیں کے ہو لئے۔ مگر وہ شراب نہیں پیتا اور اسے آبِ زہرناک تصور کرتا ہے۔ صرف سوسائٹی اور یارانِ جلسہ میں رہنے کا بہت شوق ہے اور کھانے کا تو دشمن ہے۔ رکابی میں کسی چیز کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ہر دل عزیز ہونے کی بہت خواہش ہے اور ہر شخص کے ساتھ ملاطفت سے پیش آنا چاہتا ہے۔ غرض کہ

---

[1] ترجمے میں حتی الوسع ترکی زبان کے طرزِ بیان اور ترکیبِ عبارت کا خیال رکھا گیا ہے۔

وہ بزم آرا و شوق افزا ہے۔

نا تجربہ کاری اور بے فکری کے خیالات رات دن اُس کی خدمت میں فخر کے ساتھ حاضر رہتے ہیں۔ اس میں تعجب کیا ہے؟ جوانوں کے لئے دل لگی چاہیئے۔ وہ بھی اپنا دل بہلاتا ہے۔ وہ بھی روایت پرور افکار کا محکوم ہے۔ کچہری ہفتہ میں صرف دو تین دن جاتا ہے۔ باقی تمام وقت لایعنی اشغال میں صرف کرتا ہے اور ہر جگہ ایک مجبوبہ سودا انما رکھتا ہے۔

وہ خوش ہے۔ زندگی کے مسائل مہمہ میں سے ایک بھی اسے اپنی طرف نہیں کھینچتا۔ اندیشہ و اضطراب سے بری ہے۔ مستقبل زمانہ کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا۔ حال میں اپنی عمر کو ایک آہنگِ عاشقانہ کے ساتھ گزارتا ہے، کھاتا ہے پیتا ہے اور پہنتا ہے۔ معیشت نے اس آوارہ مزاج پر اپنا دست تغلب نہیں ڈالا اپنے خیال میں وہ گویا اس سوچ میں ہے کہ حیات مسعودانہ کب اور کس طرح منتظم کرے۔

محاکماتِ فکریہ اور مناقشات وجدانیہ کو محکوم تعب اور آرام سوز سمجھ کر اُن سے کلیتہً مجتنب ہے۔ ہفتے کے بعد دیگرے گزرے جاتے ہیں اور وہ گھر میں نہیں آتا۔ گھر والے اس غیر حاضری پر کس اندیشہ و خلجان میں مبتلا

ہوں گے اس سے اپنے دماغ کو تکلیف نہیں دیتا ۔ اگر وہ پریشان
ہیں تو میں کیا کروں ؟ میں بچہ نہیں ہوں ، اگر غیر حاضر رہتا
ہوں ؛ رہنے دیں ۔

وہ شفقت پناہ عورت جسے ماں کہتے ہیں ۔ آنکھوں میں آنسو بھر کے
اُس کی خوشامد کرتی ہے ۔ وہ بھی تین چار منٹ کے لئے متاثر ہو کر اپنی حالت پر
افسوس کرتا ہے مگر پرانی ہوائے محبت اس نقش کو بہت جلد زائل کر دیتی ہے ۔
وہی فکر ، وہی مشرب اپنی فرمان روائی پھر شروع کر دیتے ہیں ۔ جو شخص کہ
چند ساعت پہلے اپنی والدہ کے حضور میں محجوبیت اور ندامت کے ساتھ حاضر تھا
اب وہی اپنے پرانے شبانہ اشغال میں شریک ہونے کے لئے موجود ہے ۔ شام
کو دسترخوان کے گرد جمع شدہ خاندان میں ایک شخص کی عدم موجودگی کیسی
عمیق سکوت کا باعث ہوتی ہے ۔ والدہ پریشان اور اندیشہ ناک نظروں سے
اپنے جگر پاروں کو دیکھتی ہے ۔ بڑے بھائی کی غیر حاضری کی وجہ سے دلگیر ہو کر
چھوٹے چھوٹے بچے تمام تر معصومانہ سے کہتے ہیں (اماں ! ہم کھائیں بھائی تو
آئے نہیں) بغیر کسی لطف اور لذت کے پیٹ میں کھانا ڈال کر علیحدہ
ہو جاتے ہیں ۔

سب پڑوسی نوجوان کے انجام سے ڈرتے ہیں۔ اُس کی اصلاح کے متعلق اُس کی ماں سے سوال کرتے ہیں۔ مگر افسوس ماں بیچاری کیا کرے۔ وہ نصیحت سُنتا ہی نہیں۔ ہم کہہ نہیں ہو چکے ہیں کہ وہ ہوا و ہوس سے مغلوب ہے اُس کو اُس کے مشاغل سے باز رکھنا سخت مشکل ہے۔ ہوس نے اپنا سکہ جما رکھا ہے بُرائیاں حکمرانی کر رہی ہیں اور طالع مساعد ہے اور کامرانی زیادہ۔ جوان کو ماں نے ایک تقریب سے دوسرے شہر میں بھیج دیا کہ شاید اسی ذریعے سے اُس کی آشفتہ مزاجی میں کمی ہو۔ وہ چلا گیا۔ مگر کیا اُس کی حرکات مجنونانہ میں کوئی کمی ہوتی؟ غلط غلط تخفیف نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک عارضی سکون نے اُس کے دماغ کو خواہشات نفسانی کی طرف سے سکتہ میں ڈال دیا اور امور معیشت کیا چیز ہیں اور حیاتِ ساعیانہ کسے کہتے ہیں۔ یہ اُسے بتانا شروع کیا۔ اُس کی خواہشیں زائل نہیں ہوئیں۔ صرف ذرائع مفقود تھے۔ حیاتِ ماضی اُس کے تخیل سے وابستہ تھی۔ ہاں کبھی کبھی یہ بھی خیال دل میں جاگزیں ہو جاتا تھا کہ گناہ کس قدر آرام سوز اور طاقت فرسا ہیں۔ ان خیالات سے اُس کی پریشانی اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ مسائل مہمہ حیات پر غور کرنے سے اُس کی حالت بحران تک پہنچ جاتی تھی اور اس زمانہ میں بلا کسی کو بھیجنے کے ارادے کے وہ

جواب دیا گیا۔ "پئیں گے"۔

"یہاں؟" "ہاں"۔

جوان کانپ اٹھا۔ بارونق و مکلّف عشرت گاہوں میں جب ایک قطرہ منھ میں نہیں ڈالا تو اس مردار و نفرت انگیز مقام میں کیوں کر پی سکے گا۔؟ اس آب زہرناک کو جو گھری کائی میں دبے ہوئے پیپے سے نکل رہی تھی کیوں کر اپنے معدہ میں اتار سکتا تھا؟ غرض کہ جوان کی حالت ایسی ہوگئی کہ گویا وہ ہرگز نہ پیئے گا۔ لیکن ۔ ۔ ۔ لیکن بات دے چکا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ اپنی بات کی سچائی پر کبھی اس نے تکرار کی تھی؟ اب اس کے خلاف اس کے امکان سے خارج تھا۔ خیر خیر نہ پیئے گا! اس آب زہرناک کو منھ میں نہ ڈالے گا۔

خدمت گار نے اپنے ناپاک ہاتھوں سے ان کے بیچ میں قدح اور شیشے رکھنے شروع کیے۔ اس بیت القسوۃ۔ اس دار الخبائث میں پینے سے مزہ کیوں کر آسکتا تھا؟ جوان نے پھر سب کی طرف دیکھا۔ اتنے میں ایک تیز آواز نے کہا "پانی لاؤ"۔ یہاں پانی کہاں؟ یہاں پانی سے مراد لوازم نوشا نوش ہیں۔ جوان کسی طرح اپنے رفیقوں میں شریک نہ ہو سکتا تھا اور

وہ "آپ کی صحت" "آپ کا شرف" کہہ کہہ کر اصرار کر رہے تھے۔ مگر وہ پیالہ ہاتھ میں نہ لیتا تھا۔ چہرہ پر تموجاتِ کراہت اور حسیاتِ نفرت ظاہر ہو رہے تھے۔ مگر افسوس زبان سے نہ کہتا تھا۔

تردد و خلجان و پریشانی کے ساتھ ہاتھ میں پیالہ لیا گیا۔ ایک لرزشِ خفی تمام جسم میں دوڑ گئی جیسے بڑی سردی معلوم ہو رہی ہو۔ اس طرح کہ اُس کے دانت بجنے لگے۔ بڑھایا ہوا ہاتھ بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ اصرار اور رجائے اس دستِ متردد کو پھر بڑھایا۔ مگر منہ تک لے جانے کی حالت میں یکایک پھر ٹھیر گیا۔ اختلاجاتِ وجدانیہ کی تاب نہ لا سکا اور کہا "پی نہ سکوں گا" مگر ابھی پیالہ ہاتھ میں ہے۔

کیا جانے کیا ہوا؟ دو معنی دار نظروں نے اُسے گھور کے دیکھا اور پیالہ خالی کر دیا گیا۔ اُس کے جسم میں ایک حرارت آئی۔ اور اُسے اپنے اوپر اختیار نہ رہا۔ دوسرے پیالہ نے حرارت میں تخفیف کی شیشہ خالی کیا گیا۔ اور اب اُسے نشوۂ مستی کا احساس ہوا۔

کیا تم یقین کرو گے؟ متاسف ہے۔ آیا پینے سے؟ اور شاید اس وجہ سے کہ ابھی جھجکوں میں نہ پی اور پی تو یہاں!

نشوۂ خمار نے فریفتہ کر دیا۔ میدان پا کر پینا شروع کر دیا۔ یہی ہوتا ہے
بات پہلے ہی مرتبہ کے نہ پینے میں ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔
جوان اس وقت سے اپنی زندگی زہریلی کر رہا ہے۔

فسانہائے عشق

(۱)
ہندوستان کی رقاصہ

میں ہندوستان کی سب سے زیادہ حسین رقاصہ تھی۔ میرا نازک جسم سانولا سلونا تھا۔ جس پر جزیرہ سراندیپ کے صدف و شفاف موتی دمکتے تھے۔ میری ہر وضع ہندوستان کے حسینوں کی پھرتیلی اور بے امان حرکتوں سے زیادہ فسوں کار تھی۔ میری بوٹی بوٹی اس زہریلے سانپ کی طرح جو جتنا زیادہ زہریلا ہو۔ اتنا ہی دل نشین طریقے سے لہراتا ہو۔ بل کھاتی تھی۔

میں ایک مخلوق تھی جس نے شعر حرکت کو اپنے تمام بدائع اور نیرنگی کے ساتھ اپنے جسم میں جمع کر رکھا تھا۔ میرے ننگے پاؤں کے گھونگرو۔ میری ہر ٹھوکر پر، میرے کبھی گرے، کبھی اٹھے ہوئے ہاتھوں کے بازوبند، میرے تمام آہنگ رقص میں نغمہ کار و مترنم ہوکر شریک ہوتے تھے۔ دنیا کا تمام عشق، نیچر کی تمام صناعی، تمام خوبصورتی میرے رقص میں کبھی جلا دینے والی کبھی مار ڈالنے والی اداؤں کے ساتھ کانپتی ہوئی نظر آتی تھی۔ پھر میرا سر؟

اس کے ایک جنبش ایک اشارے میں میرے سانولے جسم پر جو شعر و آہنگ کی جان تھی، لمبے لمبے سیاہ ریشمی چمک دار بال بکھر جاتے تھے۔ میری آنکھیں؟ میرے ابروئے خم دار کے نیچے۔ وہ ایسی بڑی اور روشن آنکھیں تھیں جیسی اُن غزالوں کی ہوتی ہیں جو گرمیوں میں جنگل کے محفوظ ترین گوشہ میں پانی پینے کے لئے جھجکتے ٹھٹھکتے آتے ہیں۔

میرے اُن مسی مالیدہ ہونٹوں میں سے جو نہایت گرم ملک میں کھلے ہوئے قرنفل کے پھول کی طرح تھے۔ صاف شفاف موتیوں کی لڑی چمکتی تھی۔

سارا ہندوستان مجھے رقص کی دیوی سمجھ کر پرستش کرتا تھا۔ میں بڑے بڑے راجاؤں کے سامنے ناچ چکی تھی۔ ناچتے وقت موتیوں، یاقوتوں اور جواہرات کی مجھ پر وہ بارش ہوتی تھی کہ میرے دوپٹے کے ہر تار میں وہ پروئے جا سکتے تھے۔

مگر میں پھر بھی خوش نہ تھی۔ میری روح میں ایک بارد نقطہ تھا جس تک نہ میرے حسین جسم کا حسن اور نہ اس فسوں کار اور گرم مملکت کی گرمجوشی پہنچ سکتی تھی۔

اُن جہنم کی طرح گرم دنوں میں بھی جب کہ جنگل میں ہاتھی گینڈے اور

عزال اور بارہ سنگھے اور درندے آپس میں لڑنا بھول جاتے ہیں، یہ نقطہ
خنک ہی رہتا۔ تمام زمین سے جس وقت شعلے نکلتے ہوتیں اور آسمان سے
گرم لپٹیں آ آ کر تمام جانداروں کو جھلستی ہوتیں۔ میں اس نقطہ بارد کی
سردی میں ٹھٹھرتی ہوتی۔ اس لئے کہ عورت کی روح کا یگانہ آفتاب یعنی
عشق میری روح پر پرتو فگن نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کہ محبوب کی نگاہوں کے
چمکدار تارے صرف جن سے عورت کے روح کی فضائے تاریک منور ہوتی
ہے۔ ابھی تک سیاہ بادلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ایک دن میں شیوجی کے
مندر میں گئی۔ کہ اس تاریکی اور برودت کی جو میری روح پر طاری تھی۔ آن سے
شکایت کروں اور اُن سے التجا کروں کہ وہ روشنی اور گرمی مجھے بخشیں۔
مندر کی تنہائی میں سے ایک نازک اندام نوجوان جس کی آنکھیں آتش سیاہ
کی طرح چمک اور حرارت برسا رہی تھیں۔ میری طرف آتا نظر آیا۔ اُس کے
قیافہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مقدس برہمن ہے۔ میں کہہ چکی ہوں کہ اس کی
آنکھوں کی چمک میں بلا کی حرارت تھی۔ اس لمحہ میں اس کی روح کی سیاہ چمکدار
کھڑکیوں میں سے میری روح کے بارد نقطہ پر ایک آفتاب عشق طلوع ہوا
اور اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ اس جہنمی اقلیم کے تمام ذرات میں ایک

موانست پیدا ہوگئی۔ آسمان اپنے ستاروں کے ساتھ، فضا اپنی نامتناہی ہول کے ساتھ، زمین اپنے خنکیوں، اپنے ذی روح مخلوقات، اپنے تمام شاندار دریاؤں اور پہاڑوں کے ساتھ بیدار ہوگئی اور میری روح میں آفتابِ عشق سے اس طرح حرارت پیدا ہوئی۔ کہ اس کا ایک ذرہ بھی بارد نہ رہا۔

غرض کہ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ دنیا کی ہر شے کو اور مجھے ایک روح افزا آتش گرم کر رہی ہے۔ مگر اس نے اپنی روح سے بھیجے ہوئے شرارے سے مجھے اور ایک عالم کو حرارت دے کر اپنی روح کی کھڑکیوں کو اپنی متین پلکوں سے بند کر لیا اور نکلا چلا گیا۔ وہ تو نکلا چلا گیا۔ مگر میری زندگی اُن گرمیوں کی آتش ریز راتوں میں زمین کے گرم سینہ پر محموم اور تپ زدہ زندگی تھی۔ دنیا کا سینہ اس عشق سے دھڑک رہا تھا۔ جس کی درختوں اور خنکیوں میں ہر قسم کی مخلوق بستہ فتراک تھی اور اب میں بھی ہر نفس اور ہر لمحۂ حیات میں دنیا کی ہم آہنگ تھی۔

میں ہر روز مندر کے دروازے تک جاتی، تاکہ بھکاریوں کی طرح اس کی ایک نگاہِ غلط انداز کا دان اس سے مانگوں۔ مگر وہ ہرگز ہرگز میری طرف نہ دیکھتا۔

بے نظیر ہیرے، دل ربایانہ سبزی سے چمکنے والے زمردؔ آنکھوں کو

خیرہ کرنے والی ونمک کے یاقوت، وہ موتی اور جواہرات جو سنگدل معشوقوں کو
موہ لیں اور ان کی نظرِ التفات خرید لیں، یہ سب اس کی ایک نظر کے سامنے
میرے نزدیک ہیچ و بے رنگ تھے۔ اس نظر کے سامنے جس سے اس نے
تمام کائنات کو آفتابِ عشق سے سوزاں و فروزاں کر دیا تھا۔ ان ہیرے
جواہرات کو میں "شیوجی" کے مندر پر لے گئی اور دیوتا کے قدموں پر میں نے
ان کو بکھیر کر نچھاور کر دیا۔ کہ وہ اپنے پجاری کی اک گوشۂ چشم میری طرف
پھیر دے۔ ایک ذرۂ آتش مجھے دلا دے۔ مگر میں اک نظر، اک نوازش کو
بھی ترسا کی۔

گرمی کی اک شام تھی۔ خشک زمین میں ایسے دراڑے پڑے ہوئے تھے
جیسے کسی کا پیاس سے منھ کھل گیا ہو۔ دنیا گرمی سے کباب ہو رہی تھی
اس وقت میں مندر کے دروازے پر کھڑی ہوئی اس کا انتظار کر رہی تھی
زرد غبار سے آسمان ایک ایسا سنہری گنبد معلوم ہوتا تھا۔ جو گرمی سے
پگھل رہا ہو۔ اس سنہری گنبد میں وہ چاندی کی آنکھیں ایک ایک کر کے
کھلنی، چمکنی شروع ہوتیں۔ دور سے جنگل کی ہیبت ناک درندوں کی آوازیں
دھاڑیں سنائی دیتی تھیں۔ مندر سے اک کالا ناگ بل کھاتا ہوا نکلا اور

چلا گیا۔ چاند ایک سنہری تھال کی طرح، درختوں کی سیاہ شاخوں پر سے نکل رہا تھا۔ میں نے اُس کے پاؤں کی آہٹ سُنی۔ جوں ہی وہ مندر کے دروازے کے قریب آیا میں اُس کی طرف بڑھی۔ اور میں نے اس سے منت کیں کہ میرے ساتھ چلے۔ وہ تھوڑی دیر ٹھٹکا، چاروں طرف دیکھا۔ اس تنگ مقام سے خشک میدان کی طرف اور اس کے بعد جنگل کے تاریک اور تناور درختوں کی طرف چاندنی کی روشن لکیر جا رہی تھی۔ وہ بھی اُس پر پڑ لیا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔ ہر چیز پر خاموشی اور مدہوشی طاری تھی۔

میدان میں پہنچ کر وہ ایک بڑے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا:-

"اے عورت! بول کیا تو اپنی زینت، اپنے حسن، اپنی جوانی کے بل پر کیا اُس گناہ فسوں کار کے بل پر جو روح کو پھندے میں پھنسا لیتا ہے۔ میرے دل کو پھسلانا چاہتی ہے۔ میری روح پر اب تک کسی لذتِ نفس کا دھبا نہیں لگا ہے۔ وہ پاک وصاف ہے۔ تیری آنکھوں سے نامتناہی جذباتِ عشق کی لپیٹ میری روح کی گہرائیوں کی طرف آ رہی ہے اور میرے شباب کی بشری آرزوؤں کو جنھیں میں نے اب تک روکا تھا بھڑکا رہی ہے۔ تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟"

چاند اس وقت سیاہ جنگل کے عین اوپر آچکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیوتاؤں نے ہمارے عشق کو روشن کرنے کے لئے ایک سنہری مشعل بھیجدی ہے میں نے اس کا جواب نہ دیا۔ صرف زرد باریک ریشم کے دوپٹے کو اوڑھے ہوئے جس کی کامدانی پر چاند کی شعاعِ پُرفسوں پڑرہی تھی۔ میں نے اس کے سامنے اپنا بہترین، اپنا استادانہ ناچ ناچا۔ اور زبان رقص سے اپنی شکایت عشق کہی۔ اس وقت چمکدار لباس میں میرا جسم، میرے بازو اور جسم ہی نہیں میری روح بھی بلیغ و آہنگ دار تجلیات کے ساتھ اس کے حضور میں رقص کر رہی تھی۔ میں اس وسیع میدان میں چاند کی زرد اور تنہا روشنی میں ایک چاند کا ٹکڑا معلوم ہو رہی تھی یا ایک بسنتی پری بنی ہوئی تھی۔ اور میں اپنی روح کے تمام درد و آلام کو تمام حسرت و اضطراب کو، اپنی اوضاع کی اشعار سے (زبان سے نہیں) اس سے کہہ رہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ کہ اس کی سیاہ آنکھوں کی تابش سے اس کی روح اس کا دل میری طرف آرہا ہے اور آرہا ہے اور قریب آرہا ہے۔

لیکن عین اس وقت ڈراؤنی آوازیں مجھے سنائی دیں۔ میں نے سر پھرا کر دیکھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک غول ایک خوفناک مخلوق کا جن کے چہرے سیاہ
جن کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ ننگے پاؤں، ننگے سر میری طرف بڑھا چلا آرہا ہے
ان کی نظروں میں قہر و غضب۔ ان کی آوازوں میں تہدید اور ڈپٹ ہر لمحہ اور
بڑھتی جاتی تھی۔ وہ میری طرف اور بڑھے۔ چاندنی کی سکوت میں اس میں سے
ایک سوکھی ہوئی ڈراؤنی آواز نے کہا:

"ایک پاک باز آدمی کو اس نے بھٹکایا ہے۔ اس کی منحوس روح شیطانی
ہے۔ اس کو اس کے جسم سے نکالو اور آگ میں ڈالو۔"

(ب)

مصر قدیم کی محبوبہائے عاشق نواز

چاند نے کہا کہ:

جون کے مہینے میں جب کہ ریگستان آتش و حیات سے متحرک ہوتا ہے،
میں ایک رات اُس سنہرے ریت کے سمندر پہ جس میں اہرام خوابیدہ ہیں،
اُن ہلکے بادلوں میں جو نیل گوں آسمان پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں، مصر علیا
سے مصر سفلی کی طرف پیرتا ہوا جاتا ہوں۔ دریائے نیل کے سبزی مائل
سست خرام پانی کی سطح منور پر، میرا چہرہ کنارے کی نمدار شاداہیوں میں سے

چھن چھن کر پھیلتا ہوا نظر آتا ہے، اور میں خود اس کی سیر کرتا ہوں۔

ہر سال، مقررہ رات کو تینوں اسی جگہ سے نکلتی ہیں جو خُرما کے درختوں کی شاخوں سے ڈھکی اور چھپی ہوئی نیل کی ایک محرمیت ہے اور جہاں وہ ہر سال غوطہ کھاکے غائب ہو جاتی ہیں۔ ہر سال اسی رات کو اسی مقام سے نکل کر تینوں اپنے افسانہائے عشق بیان کرتی ہیں۔ اس کے بعد تینوں میری آخری شعاع کے ساتھ، سنہری مائل نیل میں ڈوب جاتی ہیں، اور اپنے مستثنیٰ جسموں کو دریا کے نیم گرم پانی کی آغوش میں ڈال کر اپنے متفکر چہروں کو، اور اپنی مغموم اور مکدر آنکھوں کو جو اُن کے اضطراب آمیز عشقوں کا آئینہ ہوتی ہیں۔ آسمان کی طرف متوجہ کئے ہوئے ماضی کی طرف جہاں سے آتی ہیں لوٹ جاتی ہیں۔

---

(۱)

سب سے اول زلیخا نکلتی ہے اس کے سیاہ بال نہایت شاندار طریقہ سے گندھے ہوتے ہیں، جن پر ایک سفید سادہ اوڑھنی پڑی ہوتی ہے۔ آنکھیں بڑی اور سیاہ ہیں جو اس طرح چمک رہی ہیں جیسے دو سیال آفتاب

اُن کی تمام حرکات ایک عمیق اور معنی دار مقدس بھجن کی طرح پُرآہنگ،
متوازی اور سنجیدہ ہیں۔ وہ مصر کی سب سے پُرانی عاشقہ اور تمام عالمِ ماضی
کی سب سے زیادہ حسین عورت ہے۔ اُس میں ایک ایسی پُرعظمت ادا ہے جو
صرف اُن عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ جن کا قلب سوائے ایک منتخب آتش کے
شعلہ کے، ہر چیز کے لئے بند ہو چکا ہے، جو ایک یگانہ اور برگزیدہ عشق کی
مجتنزائیوں میں اپنی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ سال میں ایک مرتبہ اس
برکت دار اور حاصل خیز زمین پر جو اُس کی صحنۂ عشق و حیات رہ چکی ہے
آتی ہے۔ اُس کے بازو اور شانے سادہ مگر پُرارمان حرکتِ حیات سے
متحرک معلوم ہوتے ہیں، ہوتے وقت، خرمے کے درختوں کی شاخوں کے
نیچے، ہوا میں اوپر تلے آتی جاتی ہے اور اُس کی عظمتِ رفتار سے ایسا
معلوم ہوتا ہے، کہ وہ زمین سے کسی زیادہ بڑے سیّارہ کی ملکہ ہے، اُس کی
آوازیں گہرے، صمیمی اور دردانگیز نغمے بھرے ہوتے ہیں، وہ کہتی ہے:۔
" اے ارضِ مقدس! جس نے میری روح کو آتش و حرارت میں
مبتلا کیا ہے۔ لے تیرے پُرفیض، حیات و فراوانی بخش سینہ پر تیری حقیقی
بیٹی پھر آئی ہے، جس طرح تو اپنے سینے، اور اپنے دل کی گہرائیوں میں سے

آخری قطرۂ محبت و فیض کسی کو دینے سے دریغ نہیں کرتی لیکن خاموش رہتی ہے۔ تب بھی اپنے عشق کے درد و سوز کے بیان کرنے اور اس تصویر میں رنگ بھرنے سے احتراز کروں گی، مگر کیا یہ بھی نہ کہوں کہ تیری حقیقی اولاد یوسف نے ہی، میری اس عصمت و وقار کے باوجود، میری روح میں یہ آگ بھڑکائی تھی۔ وہ جب اس دنیا میں تھا، اس وقت جس طرح میرا دل اپنی منفرد اور پوری قابلیتِ جوشش کے ساتھ، اُس پیارے چہرے کے لئے تڑپتا تھا، اب بھی اسی طرح تڑپتا ہے۔

تو اپنے فیض کو، اپنی ٹھنڈی اور بے جان برکت کو آخری دم تک اپنی اولاد کو بخشے گی۔ میں، تیری سچی بیٹی زلیخا بھی ابتک اپنی روح کے آخری شعلے، آخری حرارت کو اُسی کے لئے محفوظ رکھوں گی"۔

اپنے ایمانِ عشق کی اس طرح صمیمیتِ روح سے تکرار کرکے وہ اپنے لمبے اور شاندار بازوؤں کو اس نمناک و پرفیض زمین کی طرف اس طرح بڑھاتی ہے گویا اُس سے لپٹنا چاہتی ہے، اس کی تقدیس کرتی ہے اور آخرکار اُن سبز ہلکی موجوں میں جو اُسے اپنی شیریں آغوش میں لینا چاہتی ہیں ڈوب کر چلی جاتی ہے۔

(۳)

اس کے بعد کلیوپیٹرا اپنے تمام طنطنہ احتشام، اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ نکلتی ہے۔ وہ اُس سج دھج سے آتی ہے جو اُس نے اپنے آخری سپاہی عاشق کو دکھائی تھی، اُس عاشق کو جس نے اس کے متلوّن اور ہرجائی دل کو موہ لیا تھا۔

سواری کا بجرہ سونے کا ہے، چپو چاندی کے ہیں، بادبان ریشم کے، جن میں سے وہ معطر خوشبوئیں نکل رہی ہیں جو لذیذ آرزوؤں سے ہوا کو بھی مست کر رہی ہیں۔ خود زرتار تکیوں سے کمر لگائے اپنی حسرت اور ارمانوں کو لئے دعوت کار، طلب گار لیٹی ہے۔ اُس کے نازک نرم جسم کی ادنیٰ حرکت میں لطیف اشاراتِ احساس پیدا ہوتے جنھیں لطیف موسیقی سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے اور نہیں سمجھا سکتی۔ اُس کے سادہ سلے نازک چہرے کے گرد، اُس کے چمکیلے اور نرم بال، اک ادائے تسلیمیت سے اپنی پوری رونق کے ساتھ پڑے ہوئے، ایک دل آویز تصویر کا چوکھٹا بنے ہوئے ہیں۔ اس کی دلکش پیشانی ہیں، اس کی مخمور آنکھیں ہیں، اُن ہونٹوں میں جس کی ہر جنبش میں اک داستانِ عشق پنہاں ہے،

اُس کے حسین جسم کے ہر عضو میں، غمِ الفت، دیوانگیٔ محبت، ابتلا و مظلومیت جلوے دکھاتی ہیں، اس عورت کا سیما، اس عورت کی روح نامتناہی ہے۔ اس کی زندگی ایک مدید لمحہ رقص رہی ہے جس میں وہ ہر آن ایک نئے جلوے، اک نئی روح سے ظاہر ہوتی ہے، اس وقت کہ اس کا بجرہ نیل پر تیرتا ہوا جا رہا ہے، اُس کے چہرے کے گرد ہزارہا روحیں جنھوں نے اس کے عشق کے عذاب اٹھائے ہیں، اب بھی اُن عذابوں سے آتش زیرپا مگر پروانہ وار چکر لگا رہی ہیں۔ ان پروانوں میں کون کون ہے؟ بڑے سنجیدہ دماغ والے، عقل مند لوگ ہیں جو اُس کی متلون مزاجی، کبھی متواضع کبھی مغرور اداؤں کے شکار ہو چکے ہیں، بڑے بڑے با اختیار، محتشم شاہنشاہ ہیں، یہ اُس حسن کی کشش میں کھنچے چلے آئے ہیں جسے وہ زہرہ سے مانگ کر لائی ہے۔ یہ بچارے سب کے سب وہ اسیر ہیں جنھوں نے تھوڑی دیر کے لطف اور وجد کے بدلے میں اُس کے بیدرد ہاتھوں سے زہر کے پیالے پیئے اور نیل میں ڈبوئے گئے۔ یہ کہنا چاہیے کہ اس تماشا گاہِ عالم میں وہ ایک بڑی ایکٹرس تھی، جو عشق کا کھیل کھیلنے، نہیں نہیں، بلکہ عشق کی زندگی بسر کرنے ہی کو آئی تھی۔

مگر آج کی رات، جب کہ جون کی گرمی میں ریگستان آتشِ حیات سے متحرک ہے، اور وہ زمین پر اپنا پرانا فسانۂ عشق بیان کرنے آئی ہے، اس کا ایک بھید ہے جسے میں ہی سمجھتا ہوں اور دنیا میں کوئی نہیں سمجھتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بظاہر ظالم عورت، ایک کمزور عورت ہے جو تمام عمر عشق کے ہاتھوں ستائی گئی۔ وہ ایک ملکہ ہے جس کی تمناؤں کا اتنا خون ہوا کہ وہ ایک سانپ سے موت کی بھکاری ہوئی۔

وہ بہت کم باتیں کرتی ہے۔ مگر اس کے اوضاع، اس کی حرکات سے کیا کیا نہیں نکلتا۔ مثلاً جس وقت وہ اپنے آخری عذابِ الیم کو دوبارہ اس زمین پر بیان کرنا چاہتی ہے تو وہ صرف اپنے ہاتھ کو نیل کی کیچڑ میں ڈالتی ہے۔ وہاں اسے ایک چھوٹا سا سانپ ملتا ہے جسے وہ باہر نکال لاتی ہے اور اسے اپنے سینے پر رکھتی ہے۔ پھر اپنے عبا کو اپنے اوپر ڈال لیتی ہے اور اس جسم کو جو موت میں بھی ایک طرف قیصر و کسریٰ کی شان یاد دلاتا تھا، اور ایک طرف ایک پھول ایک ستارہ، یعنی ایک عورت کا جسم تھا اس شاہانہ لباس سے ڈھک لیتی ہے اور نیل کے سبزی مائل پانی میں جو اپنے شیریں آغوش میں اسے لینے کے لئے منتظر ہے، اپنے تئیں ڈال کے

غائب ہو جاتی ہے۔

(۱۴)

سب سے آخر میں ہیپاشیا سبز موجوں کے پردے کو ہٹا کر یکایک نیل کے کنارے نکلتی ہے، کہنیاں گھٹنوں پر رکھے، سر ہاتھوں میں لئے ستارے کی طرح روشن آنکھوں کی تمدار نظریں نیل کی طرف کئے ہوئے وہ بڑی دیر تک، نیل سے رازِ دل کہتی ہے۔ میں اس حسین و متفکر چہرے کو بہت پیار کرتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ اسکندریہ، مرمر کی سفید عمارتوں، کتب خانوں، عجائب خانوں اور باغوں سے اک شہرِ مخیل جیسا دل ربا شہر بنا ہوا تھا اور وہ کاندھوں پر نرم ریشمی عبا ڈالے، پاؤں میں خوبصورت چپلیاں پہنے اس شہر میں مصروفِ خرام تھی، دماغ میں نفیس افکار، عالی فلسفے بھرے ہوتے تھے۔ اس کی روح کی طرح اس کا جسم بھی پاک و عصمت مآب تھا، اور اس عصمت کے حظِ تکبر سے متکبر رہتا تھا۔ اس ملک میں جس نے اپنے سنگِ مرمر کے سوا، ہر چیز کو میلا اور لکہ دار کر دیا تھا، صرف ہیپاشیا کی روح پاک و صاف تھی، اُس کے افکار، اُس کے خیالات، اس کی

نظریں اس قدر زمین سے علیحدہ، اس قدر گردوں پیما تھیں، کہ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ وہ کوئی سرابِ فلکی ہے۔ میری اور اس کی شناسائی اسی زمانے سے ہے۔ میں جس وقت اسکندریہ کے اوپر سے گزرتا تھا، وہ اپنی پاک اور خوبصورت آنکھوں پر دُوربین لگا کر مجھے گھنٹوں دیکھا کرتی تھی اور پھر پاپیرس کے تختہ پر عجیب خطوں سے کچھ لکھا کرتی تھی۔ حسب معمول میں ایک رات اسکندریہ سے گزر رہا تھا، اور حسب معمول میں نے اس کی کھڑکی میں سے جھانکا۔ میں نے اس کا گھر خالی پایا۔ آج زلیخا و کلیوپیٹرا کے بعد جو وہ نکلی تو میں نے اس سے پوچھا کہ کرۂ خاک سے وہ کیوں روپوش ہوگئی؟ اس نے اپنے پیارے سر کو جو یونان کی عقل و حکمت کی دیوی اتینا کا ٹیکلی گاہ بنا ہوا تھا میری طرف اٹھایا اور اس پاس سے جو تمام علما و کملائے دہر کو دنیا سے رہی ہے، اس نے مجھ سے کہا:۔

"میں نے انسانوں کو قعرِ ذلت میں سے نکالنے اور ابھارنے کی کیا کیا جدوجہد نہ کی۔ اے پیارے چاند! تو اس کا شاہد ہے۔ انسان، جس وحشیانہ بہیمیت میں مبتلا ہے، وہ نظارہ اپنی دل خوں کن تجلیوں میں میری آنکھوں کے سامنے تھا، مگر میں اس وقت اس پاک و علوی خواب کو دوبارہ

دیکھ رہی تھی جو افلاطون کی بزرگ روح نے انسانوں کے لئے دیکھا تھا۔
میں چاہتی تھی کہ سب انسان، آنکھ، روح اور فکر کے ذریعے، پروردۂ حسن
خیالی ہوں۔ فطرت کی خوبصورتی، صنعت کی خوبصورتی، اُن کے چاروں طرف
تبسم ریز ہو، وہ اُن کے دماغ حسنِ سماوی کی طرف بالا پرواز ہوں۔ میں
چاہتی تھی کہ انسان کے قوائے ذہنیہ علم کے زیور سے آراستہ ہو کر، کہ
قوائے ذہنیہ ہی انسان کی بلند ترین تجلی ہیں، مادہ اور جسم کی سفلیت و
تاریکی پر غالب ہوں۔ آہ! اس کے لئے میں نے کیسی کیسی کوششیں کیں،
مگر ہوا کیا؟ اِدھر اُس مولش ور روحانی مسیحا کی اُمت جو انسان کو
بچانے کے لئے آیا تھا، انسانوں کو عذاب شکنجہ میں کھینچ کھینچ کر، فکر اور
دماغ کو تعصب و جہالت سے بھر بھر کے تاریک کر رہی تھی، اور ظالم و
خونخوار بن کر میرے پاک خواب کو برباد، اور میرے تمام مجاہدے کے
مقابل میں دیوارِ آہن استادہ کر رہی تھی، اُدھر، روما کے بیمار و کثیف
بچے، اور پرتگال کے وحشی میرے رویائے عظمیٰ، میرے خواب ارتقا و نجات
انسان کو، اپنی دنی اور ذلیل حرکات سے پراگندہ و پریشان کر رہے تھے۔
آخر ایک دن آیا کہ ان ہزاروں جنس والے، ہزاروں مذہب والے

انسانوں کے انبوہ میں پیروانِ عیسیٰ بھی ظاہر ہوتے؟ ان حضرات کے تشریف لانے کے نتیجے سے، پیارے چاند! تم بے خبر نہیں ہو؟"

یہ کہتے وقت اپنے حسین جسم کی پوری قابلیتِ عظمت کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنے کندھوں کو اونچا کرتی ہے اور ایک لطیف وقار کے ساتھ جو اولمپا کے حسین اور بلند مرتبہ دیوتاؤں سے حاصل کیا گیا معلوم ہوتا تھا اپنے سر کو آسمان کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

"یہ پیروانِ عیسیٰ آئے اور اُس خونخوار درندوں کے غول کی طرح جو خون پینے کے لئے کسی کے پیچھے جھپٹ رہا ہو، مجھے اپنے کلیسا تک گھسیٹ لے گئے اور اپنے بے گناہ عیسیٰ کی تصویر کے نیچے جو مغموم مگر روحانی نظروں سے انھیں دیکھ رہی تھی، مجھے ذبح کیا اور میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ مجھے تو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، مگر میرے دماغ کے تخیلات کے ستارے، اب بھی مرتفع، اب بھی ضیا بار، اب بھی آسمانِ ابدیت میں درخشندہ ہیں اور رہیں گے۔"

اُس نے جب یہ دل دوز تقریر ختم کی، تو اُس سوز و گداز کے ساتھ جو زلیخا اور کلیوپیٹرا کے ماجرائے عشق نے مجھ میں پیدا کر دیا تھا، میں نے

اُس سے پوچھا:-

"پیاری رجنی! یہ تو بتا کہ تیرے روحانی اور بے داغ جسم کو کبھی بشری خطاؤں کا دھبہ تو نہیں لگا؟"

اُس نے اپنی نور فشاں مگر خیال پرست نظروں سے میرے دل کی گہرائیوں تک کو چھید ڈالا۔ جس نے مجھے بتایا کہ جس طرح اُس کی روح فضائے لاہوتی میں اپنے سفید پروں سے پرّاں ہے، اسی طرح بشری کمزوریوں کے جنون اور خطاؤں کی گہرائیوں میں بھی پھڑ پھڑا چکی ہے۔ مگر میں ان رازوں کو جن سے دنیا بے خبر رہی ہے کبھی زبان پر نہیں لا سکتا۔ کیا اُس نے بھی ہر انسان کی طرح محبت کے عذاب جھیلے، تاریکیوں میں ٹھوکر کھائی، شعلوں میں گری یا نہیں گری؟ اسے صرف ہیپاشیا کی روح جانتی ہے یا میں۔

وہ جب ہر سال اپنا افسانہ اپنی آنکھوں سے مجھے سناتی ہے، میں سفید اور سنہرے بادلوں میں سے نکل کر، اور اپنی زرد اور ٹھنڈی شعاعیں اُس کے محبوب چہرے، اور اُس کے پاکیزہ جسم پر ڈال کر، شفقت و نوازش سے اُس کے بوسے لیتا ہوں، اُس کی تقدیس کرتا ہوں، آخر کار وہ بھی، اُن دونوں کی طرح، سبز پانی کی شیریں اور منتظر آغوش میں اپنے تئیں ڈال دیتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔

(ج)

بخت نصر کا قیدی

بابل کے باغیچہ ہائے آویزاں میرے ہی لئے بنائے گئے تھے۔ میں بخت نصر کی محبوبہ اشتارت تھی۔ جس دیوی کے نام پر میرا نام تھا، میں اسی کی طرح حسین تھی اسی کی طرح میں ایک ریشمی لباس پہنے رہتی تھی جو مردوں کی روحوں کو قید کرنے کے لئے اک جال تھا۔ میرے دامن سے کسی کا سر چھو جائے، وہ بے چارہ اس دامن کے نرم تاروں میں پھنس کے رہ جاتا تھا۔ جتنا اس سے نکلنے کی کوشش کرتا تھا اتنا ہی اور پھنستا تھا، اتنا ہی اور اس کے گلے میں پھندا پڑتا، میرے ذرا سے حکم، میرے خفیف سے اشارے پر خون کے آبشار گرتے تھے، دریا بہتے تھے، انسان بھیڑوں کی طرح ذبح کئے جاتے تھے، دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت وہ شکل، وہ رنگ اختیار کرتی تھی جو میں اسے دینا چاہتی تھی، اور وہ تاجدارِ معظم جو تمام دنیا پر حکمرانی کر رہا تھا، میرے گورے پاؤں کے نیچے، اک زبون و عاجز قیدی کی طرح پڑا رہتا تھا، مگر میں خوش نہ تھی۔ ہاں، اگر ستارے میرے کمرے میں جمع ہو کر چراغ کا کام دیتے اور آفتاب میرے محل کو گرم کرنے کے لئے انگیٹھی بنتا، اور دنیا میرے پسندیدہ پھولوں سے لد کر میرا پائیں باغ

بن جاتی، تو بھی میرے لئے یہ سب کچھ ہیچ تھا۔

اس لئے کہ میری روح میں ایک نقطہ، ایک عمیق و حاکم نقطہ خالی تھا، اس نقطہ کو نہ دولت کی شان، نہ انسانوں کی بندگی، نہ اُن کے خون، اور نہ اجرامِ فلکی بھر سکتے تھے۔ وہ نقطہ ایک ایسے وجود، ایک ایسے رفیق کو ڈھونڈھتا تھا جو میری زندگی کے باریک ترین عنصر میں سکون و حظ پیدا کرے۔ اک دن میں اپنے باغیچہ کے سب سے زیادہ رنگین سب سے زیادہ چمکیلے پھولوں کے دستے میں لیٹی ہوئی تھی۔ کہ میرے کانوں کو سپاہیوں کی ہائے ہو، اور ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دی، یہ سپاہی ارضِ فلسطین سے فاتحانہ واپس ہو رہے تھے اور اُن کے نعرے بابل میں گونج رہے تھے۔

اب میرے حضور میں کتنے قیدی آگ میں جلائے جائیں گے، کتنوں کی آنکھیں نکالی جائیں گی، کتنوں کی کھال کھینچی جائیں گی، کیا کیا شکنجے، کیا کیا تکلیفیں کیا کیا اذیتیں دی جائیں گی، اور فریادوں کے ساتھ خون کی نہریں ہم آہنگ ہو کر بہیں گی۔ زمین میرے باغ کے محبوب ترین لالہ زار سے زیادہ سرخ، زیادہ آتشیں رنگ میں رنگی جائے گی۔ خود بخت نصر، آکر مجھ سے نئی اذیتوں، نئے شکنجوں کی ترکیبیں پوچھے گا۔ یہ ظالم و خونخوار قوم، جو اپنے معبدوں، اپنے

دیوتاؤں اور اپنی زندگی میں ظلم و اذیت اور اُس کے مظاہر کی پرستش کرتی ہے، شاید اسی وجہ سے مجھے پیار کرتی ہے کہ میں نے ظلم اور اذیتوں کے نئے نئے طریقے اُنہیں سکھائے ہیں۔

بخت نصر، وہ الہ ظلم جو دنیا میں موت اور زندگی تقسیم کیا کرتا تھا، مجھ سے آ کر راتیں بتایا کرتا تھا۔ یہ حاکم تمام روئے دنیا کے اوپر، انسانوں کے اوپر ایک حکمران مطلق کی حیثیت سے اپنی رعایا کا گلا گھونٹتا تھا۔ ایسے لمحے بھی ہوتے تھے کہ میں، اس کی رعایا کی طرح اُس کا گلا گھونٹتی تھی۔ میں نے گھنٹوں اس منظر سے لطف اُٹھایا ہے کہ اپنے مرمر کے دروازے کی چوکھٹ پر اُس کے تاجدار سر کو میں نے ٹکرایا ہے اور وہ اک زخمی شیر کی طرح غرّایا ہے اور پھر خاموش ہو کر رہ گیا ہے۔ اس رات میں اپنے محل کی سیاہ چھت کو دیکھ رہی تھی، جس میں آسمان کی تقلید میں چاندی کے چمک دار ستارے جڑے گئے تھے کہ مجھے معلوم ہوا کہ بخت نصر آ رہا ہے۔ اُس نے سب ہتھیار میرے کمرے کے دروازے پر اُتار کر رکھ دیئے اور ایک سانپ کی طرح سرکتا ہوا میرے حضور میں آیا اور کہنے لگا :-

"اشتارت! میں نے فلسطین میں ہر چیز پر قبضہ کر لیا، اور اک سرے سے دوسرے سرے تک اُسے ویران کر دیا اور جلا کر خاک کر ڈالا، مگر وہاں

اک شخص ہی جس کی روح پر میں تسلط حاصل نہیں کرسکا۔ وہ اک سپاہی منش آدمی ہے
موت کی ہر شکل پر اُس کی آنکھیں ہنستی ہیں، وہ ایک بہادر روح رکھتا ہے۔ میں
اسے برداشت نہیں کرسکتا کہ میں اسے مرعوب نہ کرسکوں۔ یہ شخص جو میرے سامنے
بالکل بے ہراس رہتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اُس کی آنکھوں میں خوف دیکھوں
تاکہ میں اُسے کس اذیت میں مبتلا کروں کہ وہ میرے سامنے کانپے"

میں نے کہا: "کل اُسے میرے سامنے لایا جائے۔ میں جانتی ہوں کہ
اُس کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے"۔ دوسرے دن، میں محل "طلائی آفتاب" میں گئی
اس کی چھت میں اک مرصع طلائی آفتاب بنایا گیا تھا، کمرے کا فرش اور دیوار و
در اُس کے طلائی نور سے دمک رہے تھے، میں اپنے زرتار بالوں میں اک
طلائی موباف لگائے ہوئے تھی، میرے حسین جسم پر اک طلائی ملبوس تھا، میں
اس طلائی کمرے میں اس دبدبہ و احتشام کے ساتھ داخل ہوئی کہ دنیا پھر اُس کی
مثال نہ دیکھے گی۔ اک طلائی تخت پر جو نہایت سبک دست، نہایت ماہر صناعوں
کی صنعت گری کا نمونہ تھا، میں متمکن ہوئی اور وہاں میں نے اُس کا انتظار
کیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ دروازہ کے مرصع طلائی پردوں کو
اک غلام کے سیاہ ہاتھ نے ہٹایا، اور بنی اسرائیل کا وہ نوجوان جو بخت نصر کے

سامنے بے خوف رہتا تھا داخل ہوا۔

مجھے اپنی طاقتِ حسن پر اتنا بھروسا تھا کہ میں جانتی تھی کہ وہ سرکش طبیعتیں جو آفتابوں، معبدوں، معبودوں کے سامنے سجدہ نہ کرتی تھیں، میرے حسن کے سامنے سر بسجود ہو کر میری پرستش کرتی تھیں۔

یہ نوجوان کمرے میں داخل ہوا ایک کھال اوڑھے ہوئے، بازو اور کندھے کھلے ہوئے۔

بابل کے سورماؤں کے سانولے ہاتھوں پر اور بازوؤں اور چہروں پہ رگیں اس طرح ابھری ہوئی ہوتی ہیں جیسے بٹی ہوئی رسّی، مگر اس نوجوان کی گوری اور ہموار جلد پر ایک ساکت اور مطمئن قوت کا احساس ہوتا تھا۔ اس کا اصلاً صبیح مگر تمازتِ آفتاب سے سرخ چہرہ کتابی تھا جس میں ایک ایسی روحانیت جھلکتی تھی جس کا میں اب تک تصور بھی نہ کر سکی تھی۔ اس کے شانوں پر گھنے سنہرے بال لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں سمندر کی اور آسمان کی نیلاہٹ اس کی روح سے مل کر ایک ضیائے رنگین پیدا کر رہی تھی اور یہ ضیائے رنگین میری روح کے خالی نقطے میں، جسے اس قدر برسوں سے، اس قدر طویل مدت میں کسی چیز نے نہ بھرا تھا، نفوذ کر رہی تھی، میری روح اب تک تشنہ تھی،

دولت کی شان، انسانوں کی عبودیت، انسانوں کے خون، اور اجرامِ فلکی ۔
جس روح کی تاریکی دور نہ کر سکے تھے، اس وقت اُس کے آنکھوں کی روشنی
اُس روح کو منور کر رہی تھی۔ اب میرے لئے، نہ دولت کی شان، نہ انسانوں
کے خون، نہ اُن کی بندگی، نہ زمین نہ آسمان، نہ اجرامِ فلکی، کچھ نہ تھے، میری
روح، میری ہستی میں سے کائنات محو ہو چکی تھی۔ میرے لئے صرف وہ سیلِ نور
تھا جو اُس کی آنکھوں سے نکل رہا تھا، یہ نور تھا اور میری روح کی وہ مسرت
تھی جو چشمے کی طرح اُبل رہی تھی۔

میں اپنے تخت سے اُتری، اُس کی ثابت اور ضیا بار آنکھوں کی طرف
سیدھی کھنچی چلی گئی۔ میں نے اپنے بالوں میں سے طلائی موباف نکال پھینکا اور
اُن قدموں کو جو فلسطین سے یہاں تک آنے میں پتھروں پر چلنے سے چھل گئے
تھے، اپنے لمبے کھلے ہوئے پریشان بالوں سے ڈھک لیا، اور کہا :-

"تو بھی اسی طرح عشق کے سنہری تاروں سے میری تشنہ روح کو جو
سالہا سال سے تیرا ہی انتظار کر رہی تھی ڈھک لے"

اُس نے چند لمحے جواب نہ دیا۔ جب اُس نے بات کرنی شروع کی تو مجھے
ایسا معلوم ہوا کہ ایک معبود اپنی معظم و نجات بخش رحمت تقسیم کر رہا ہے۔ اُس نے کہا :-

"اے عورت! "یاحودا" نے تیری روح کی طرف التفات کیا، جو تو چاہتی تھی وہ تجھے دیا تو بھی اس کرم خاص کے عوض میں بنی اسرائیل کی جانوں کو بچا" میں نے اپنا سر اٹھایا، اور اس انقیادِ مطلق سے جو میری طبیعت میں ابھی پیدا ہوا تھا میں نے کہا :-

"بہت اچھا، مگر مجھ پر اک نظر تو ڈال، مجھے اک چھوٹی سی نوازش سے محروم نہ رکھ آہ! میں کتنے برسوں سے تیرا انتظار کر رہی تھی" اس نے اپنے لمبے اور نرم ہاتھ میرے سر کی طرف بڑھائے مگر عین اس وقت بخت نصر آنکھوں سے شعلے برساتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پر غضب آواز سے کہنے لگا :-

"اس خانہ بدوش کو اپنا عاشق کرنے کے لئے تو نے یہاں بلایا تھا، لے جاؤ اسے"۔ اس وقت میں نے معلوم کیا کہ میرا تمام افسوں، میرا تمام طلسم جو انسانوں پر تھا ختم ہو گیا، اور اس جانور کے سامنے جسے میں نے اپنا مطیع و منقاد کر رکھا تھا میں عاجز کھڑی تھی، بخت نصر کا آخری حکم اس وقت تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے :-

"اشتارت کو بلوغ آدیراں میں اس کے بالوں سے لٹکا دو۔ اور بنی اسرائیل کو ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کرو"۔

گمنام خطوط

(خورشید لقا بیگم کا خط اپنے بہنوئی کے نام)

میں للت پور جا رہی تھی، رات تاریک تھی؛ اور ٹرین کے انجن کا کثیف دھواں اس تاریکی کو کچھ کم نہیں کر رہا تھا۔ بڑھا ہی رہا تھا۔ اس عظیم الشان، اور وسیع تاریکی میں، گاڑی کی کھڑکیوں میں سے نکلنے والی روشنی نے، ٹرین کو ایک چمک دار اور تیز رو، ہزار پا کیڑا بنا رکھا تھا جو جل کھاتا ہوا جا رہا ہو۔ اس محیطِ حزن و خوف میں میرے لئے ایک عجیب کشش تھی؛ میں بار بار سر نکال کے اس تاریکی پر نظر ڈالتی تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ اس میں غائب ہو جاؤں۔ میں اسٹیشن پر پہنچی؛ مگر وہاں میرے لینے کے لئے کوئی نہ تھا۔ میں جس طرح تمھیں اطلاع دیتے بغیر لکھنؤ سے روانہ ہو گئی تھی، اسی طرح بغیر کسی اطلاع کے یہاں پہنچی تھی۔ میں نے چاہا کہ اپنے شوہر سے اچانک جا ملوں بالغرض اگر میں اس تاریکی میں غائب ہو جاتی، تا کہ اس گنجینۂ حیات کو جسے تنہا میں ہی محسوس کرتی ہوں ختم کردوں؛ اور اپنے دل کی حسرتوں، اپنی روح

اپنا اسباب کو اپنے ہی ساتھ خاموشی سے لے جاؤں، تو کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا
کہ میں کہاں غائب ہو گئی اور کیونکر غائب ہو گئی۔ میں ایک عورت ہوتی جو ایک
راز، ایک معما کی طرح بغیر حل ہوئے رہ جاتی، یہ ایک ایسا محبوب خیال تھا
اگر میری لڑکی کی سیاہ آتشیں آنکھیں ابدیاً میرے لئے روتی ہوئی، انتظار
کرتی ہوئی میرے تخیل کے سامنے نہ آ جاتیں تو میں اس ارادہ کو پورا کر گزرتی
مجھے کیا خبر تھی کہ کچھ دنوں کے بعد مجھے اپنے وطن سے، ایک راز، ایک معما
کی طرح غائب ہونا ہی پڑے گا۔

انسان اپنے مستقبل کے مقابلہ میں کس قدر عاجز و ناتوان ہے۔ اُسے
نہیں معلوم ہوتا کہ اگلے چند دن، یا چند گھنٹے زندگی کی کیسی مصیبتیں، کیسی
برکتیں، کیسی خوشیاں، کیسی مسرتیں اپنے میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اگر آئندہ
کی تاریک صعوبات یا متبسم تجلیات کی ہمیں خبر ہو جائے، تو ہم شاہراہ حیات پر
اس طرح اپنے کورکورانہ چلے جانے پر کیسے ہنسیں۔ اگر اس وقت اپنی خواہش
کے مطابق میں اپنے تئیں ٹرین کی کھڑکی سے نکال کے اس فضائے تاریک
میں پھینک دیتی، تو آج کے دن اس تلخ کامی کے احساس سے بچ جاتی۔
مگر قسمت نے، اس اعتنا کے ساتھ مجھے اس جال میں پھنسایا تھا،

کیا وہ اپنے کھلونے کو آسانی سے اپنے ہاتھ سے جانے دیتی؟ ہرگز نہیں۔ غو
وہ سیدھی مجھے اس گڑھے میں لے گئی، جس کی طرف مجھے اپنی بیٹی کی سیاہ
اور خوبصورت آنکھیں کھینچ رہی تھیں۔

میں گھر پہنچی، مگر ماجد کو میں نے گھر میں نہ پایا۔ وہ دورے پر باہر گیا ہوا
تھا۔ میری لڑکی اپنی سیاہ چمکیلی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھرے ہوئے
مجھ سے آکر لپٹ گئی۔ میری ساس نے اپنی حلیم و شفیق نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا
مگر ان نظروں میں تجسس اور شبہ ملا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں گئی تو
تھی تین مہینے کے لئے اور ڈیڑھ مہینے ہی میں واپس آگئی۔ اس کی کیا وجہ
تھی؟ میرے بے خبر اچانک آنا کیا معنی رکھتا تھا۔ "میرے بچی اور ماجد کے
دیکھنے کو میرا دل چاہا" کہنے پر اس نے نیم محزون، نیم مستہزی آواز سے کہا۔
"ہاں ضرور، تمھاری اور ماجد کی ایسی ہی اچھی طرح تو گزرتی ہے کہ میں
یہ سمجھوں کہ تم اس بغیر نہیں رہ سکتیں۔"

اسے یہ کہنے کا حق تھا۔ ہماری تیرہ برس کی زندگی ایک ثاجۂ طولانی تھی
جس میں ناقابل بیان دردانگیز واقعات ظہور میں آئے تھے۔ اس زندگی کی
یگانہ شاہد اس کی ہمدرد و رحیم آنکھیں تھیں۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ کھنو کی

زندگی چھوڑ کر میں اس شخص کے لئے گو وہ اُس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، دوڑی دوڑی آؤں گی۔ خود وہ جب کبھی لکھنؤ جاتی تو ہفتوں کی بجائے مہینوں وہاں ٹھہرتی، اور گو اپنے بیٹے سے جدا ہو کر گئی تھی پھر بھی لوٹتے وقت کہتی:

"میرا سر پھرا تھا جو میں یہاں آتی"

روحاً و فکراً جس آدمی سے مجھے کوئی مناسبت نہ تھی، میں اُس کی ہر زیادتی اور سختی کا سکون و بردباری سے مقابلہ کرتی تھی؛ اُس کے سب و شتم کا کبھی میں نے جواب نہ دیا۔ اپنے خاندان اور اپنے عزیزوں میں ہمیشہ بشاش چہرہ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ میری ساس اس کوشش پر عزت آمیز شفقت کی نگاہ ڈالتی تھی۔ مگر اُسے یہ خبر نہ تھی کہ ایک عورت جس مرد سے اس قدر بیزار ہو کہ اپنی موت کی دعائیں مانگا کرے، جس مرد نے تیرہ سال تک اُسے ستایا ہو اُس کی زندگی بے مزہ و بے رنگ کر رکھی ہو اس عورت کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ وہ عورت، اُس مرد کو ناقابل وضاحت کشش سے چاہتی ہے

شام کا وقت تھا کہ بنگلے کی برساتی میں ایک دوڑتے ہوئے گھوڑے کی آواز آکر رکی؛ میں اور میری بیٹی مہ لقا، دوڑ کر دروازے تک گئے ماجد نے اپنا گھوڑا سائیس کو دیا۔ اُس کے ہاتھوں میں گہری جھریاں تھیں، اُس کی

سیاہ آنکھیں اندیشہ ناک تھیں۔ اپنے بازوؤں کو، جس کی گوشت کی پھڑک کو
میں نے ہر وقت ایک عجیب جاذب خوف سے دیکھا تھا اُس نے کولھوں پر گرا دیا
اور ایک مخصوص طریقے سے وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی پہلی نظر مجھ پر پڑی
میں اس وقت لکھنؤ کے تازہ ترین لباس میں ملبّس تھی جس سے وہاں کی
فسون و دلبری برس رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک فوری اور لطیف تغیر پیدا
ہوا۔ اس کے بعد اپنے بھاری جسم کو ہلاتا ہوا ایک دل دوز آواز سے وہ میری
طرف لپکا۔ اور اُس نے اپنی سیاہ، اور محترص آنکھوں سے دیوانہ وار میرے
چہرے کو دیکھا۔ پھر اپنی کرخت آواز کو نرم کرنے کی کوشش کر کے مجھ سے کہنے لگا۔
"خورشید! تمہارا میرے دیکھنے کو دل چاہا تھا نہ؟ لکھنؤ سے اس قدر
جلد چلی آئیں، یعنی لکھنؤ اور لکھنؤ والوں سے زیادہ تم مجھ کو چاہتی ہو؟"
یہ باتیں بالکل قدرتی تھیں، مگر میں نے خیال کیا کہ اس میں کوئی معنی پنہاں
ہیں؛ اور اس لئے مجھے ان باتوں سے خوشی ہونے کی بجائے تھوڑی سی
تکلیف ہوئی۔ لیکن اس میں کیا تھا؟ میں سوچتی تھی کہ اس دماغ میں جو صرف
مادہ اور ہوس سے پُر تھا کیا اور کوئی گریزاں شبہ بھی پھر رہا تھا؟
پہلے دو تین دن تو ہم نے ایک نوخیز عشق کے غشی آور جوش میں

گزارے۔ کمرے پر پردے گرا دیئے گئے۔ لانگ بوٹ اور وردی اُتار کے پھینک دی گئی۔ یہاں تک کہ جب اُسے خبر دی گئی کہ اُس کی محبوب گھوڑی تھان پر بندھے بندھے شرارت کر رہی ہے، تو اُس نے اپنے چوڑے سینے کی تمام قدرت وسعت کو کام میں لا کر گرج کے کہا:

"جاؤ، ہٹو! اگر پورے ضلع کو ڈاکو لوٹ مار کر کے تباہ کر دیں، تو بھی میں فی الحال ٹس سے مس ہونے والا نہیں ہوں۔ گرج یہاں سے اٹھاؤ، وردی کو میرے سامنے سے ہٹاؤ۔ اماں جان سے جس نے تجھے بھیجا ہے میری طرف سے کہو کہ میری بیوی کو آئے ابھی تین دن ہی تو ہوئے ہیں! ایک ہفتہ تک سب انھیں کے سپرد ہے چلو!" "کوئک مارچ!" یہ کہہ کر گلشن آرا کو جو ایک مضحک خوف سے اُلٹے پاؤں جا رہی تھی، ماجد نے نکالا اور دروازہ بند کر دیا

اس کی عمر ۳۸ سال کی تھی، مگر اُس کے دل اور جسم کی طراوت دس سال پہلے کے شباب کو یاد دلاتی تھی۔ آج بھی وہ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسا کالج سے تازہ تازہ نکل کے، فوراً ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر ہونے اور میرے ساتھ بیاہے جانے کے وقت تھا۔ مگر اب میں وہ لڑکی نہ تھی جو بیاہ کے بعد اُس کے گھر میں آ کر اُس کی روشن آنکھوں پر عاشق ہو گئی تھی۔ میری روح، حیات کے

وسیع و خلق فضا میں میرے شوہر کو جو مجھ سے عمر میں صرف پانچ برس بڑا تھا
حتیٰ ایک بچہ چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ شخص
جو اپنی بعض اوقات تحمل و سا گرمجوشی سے مجھے اکتا دیتا تھا میری زندگی کے
لطیف ترین و شیریں اوقات کا بھی باعث ہوا تھا۔ مگر اس دفعہ اس گرمجوشی نے
جس کی میں عادی تھی، معمول سے زیادہ طول کھینچا میں نے خیال کیا کہ اس کی
تہ میں ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ میں جانتی تھی کہ یہ آدمی جو مجھ سے کوئی بات
چھپانے پر مقتدر نہیں ہے؛ ضرور مجھ سے سب حال کہے گا۔ میرا اندازہ غلط نہ نکلا۔
لکھنؤ سے واپس ہوئے مجھے تین دن ہوئے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ ماجد
کمرے میں کھڑکی کے پاس متفکر و ساکت بیٹھا ہوا تھا؛ میں سونے کی کوشش کر رہی
تھی کہ وہ اپنی کرسی گھسیٹ کے میرے پلنگ کے قریب آیا، اور میرے ہاتھ
اپنے ہاتھوں میں پکڑ کے اپنے ہونٹوں تک لے گیا اور متردد اور کچھ کچھ محجوب
آواز سے کہنے لگا: "تم مجھے معاف کرو گی؟"

میں نے خیال کیا کہ میرے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں اس نے یہاں کوئی حرکت
کی ہے، اس کے لئے معافی مانگ رہا ہے۔ نوازش آمیز طریقے سے میں نے
اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے دبایا۔ وہ اپنے سامنے نظر گاڑ کے

کہہ رہا تھا :

"مجھے تمہاری طرف سے کچھ شبہ تھا۔ گو اپنے سے زیادہ مجھے تم پر اعتبار تھا لیکن میں نے ایک مہینہ اس قدر رشک کے جذبات میں گزارا کہ میں قریب قریب پاگل ہو گیا تھا۔"

میرے دل میں ایک تھرتھری پیدا ہوئی؛ میں نے تجسس کے ساتھ پوچھا:

"کس باعث اور کیوں؟"

"اگر میں کہوں تو مجھے معاف کرو گی؟"

"اس کا میں وعدہ نہیں کرتی؛ کیوں کہ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتی کہ تم مجھ پر شبہ کرو۔"

"سچ کہتی ہو، خورشید! مگر اُن خطوں میں اس خاص نقطے پر اس قدر اصرار تھا کہ ۔"

"کون خطوط، اور کیسے نقطے؟"

"چند گمنام خطوط تھے؛ مجھ جیسے سپاہی آدمی کا، ایسے کمینے اور بزدل لوگوں کی تحریروں پر اعتبار کرنا جنہیں اپنے دستخط کرنے کی بھی ہمت نہیں، بے شک قابلِ ملامت ہے۔ مگر میں نے اُن تمام خطوط کو جلا دیا۔ اور میرا

اضطراب اور شبہ تمہارے چہرے کو دیکھ کر جاتا رہا۔

میری پہلی آرزو یہ سن کر یہ ہوئی کہ مجھے معلوم ہو۔ ان گمنام خطوں میں میرا نام کس کے ساتھ لیا گیا ہے۔ مگر نہ معلوم کیوں کسی جیاں نے میری زبان پکڑ لی اور میں نے کچھ نہ پوچھا۔ کیا وہ نام تمہارا تھا؟ مگر کیوں اور کس لئے؟ میں نے اپنے ضمیر کے سب سے پوشیدہ کونوں میں نظر ڈالی۔ مجھے کوئی ایسا لمحہ، یا کوئی ایسا لفظ یاد نہ آیا جو کسی مشکل پسند ضمیر کے نزدیک بھی قابل اتہام ہو۔ یہ بھی نہیں کہ اپنے یا اپنے شوہر کے عزیزوں میں صرف تم ہی وہ مرد ہو جس سے میری ملاقات ہو۔ میرے شوہر کے ایک چچا زاد بھائی ہیں جو خود بڑے عہدہ دار ہیں۔ اُن کا میری طرف اس قدر رجحان ہے کہ اگر میں ایک سیاست داں کی ترکیبوں کو استعمال نہ کروں تو وہ مجھ سے ہر وقت اس قدر بے تکلف ہونے پر آمادہ ہیں کہ وہ یہ بھی بھول جانا چاہتے ہیں کہ میں اُن کے بھائی کی بیوی ہوں۔ میرا چچا کا ایک بیٹا ہے جو میرے بیاہ سے پہلے دو برس تک متواتر میرا طلبگار رہا، اور مجھے سو جان سے چاہتا تھا۔ اسے بھی میں نے ترکیبوں سے، عاشقی کے راستے سے ہٹا کر برادرانہ دوستی کی راہ پر ڈالا۔ اب ہم دنیا میں دو سب سے اچھے اور صمیمی دوست ہیں۔ مگر تم! تم سے تو کبھی پاک وصاف بھائی چارہ

اور دوستی کے حدود سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا گیا، اور تمہاری نگاہوں میں میں نے کبھی اخوت کی شفافیت کے سوا کوئی اور جھلک دیکھی ہی نہیں۔

مگر کیوں اس وقت، سب سے پہلے میرے ذہن میں تمہارا نام آیا؟

میں پچھلی دفعہ جب لکھنؤ میں تھی تو میں نے اعزا و احبا کی نظروں اور اطوار میں کچھ عجیب و غریب اشارے پائے۔ خاص کر، میری قمر زمانی کی مغلانی حسینی خانم کی باتیں عجیب تھیں میں اپنی ابتدائے زندگی سے دیکھ رہی ہوں کہ اس بڑھیا کی کوشش رہتی ہے کہ یہ ظاہر کرے کہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کی زندگی پر رشک ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے، جب تم قمر سے نئے نئے بیاہے گئے تھے، اور میں تمہارے باسلیقہ و خوب صورت گھر میں اپنی بہن سے ملنے گئی تھی اس بڑھیا نے یہی خیال ظاہر کیا تھا۔ کہنے لگی:

"بیٹی! مفصلات میں بھلا تمہیں ایسی خوب صورت کوٹھی رہنے کو کہاں ملتی ہوگی؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے۔"

"بیٹی، تمہاری بھی قسمت کیسی خراب نکلی۔ کیا اچھا ہوتا تمہیں رشید جیسا مشہور شاعر ملتا جو محض شاعر ہی نہیں پونڈوں کا امیر بھی ہے۔ وہ قمر کے

نصیبے میں لکھا تھا جسے پڑھنے لکھنے یا شعر و شاعری کا ذرا بھی شوق نہیں۔
تم جو بچپن سے کتابوں کا کیڑا رہی ہو، تمھیں ایک پولیس والا ملا ہے جسے
کو ڈنڈا بجانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔"

"میں اپنے اکھڑ پولیس والے سے خوش ہوں! مجھے شاعر
نہیں چاہیئے۔"

"خدا تمھیں خوش رکھے بیٹی! مگر رشید صاحب کی نزاکت و نفاستِ مزاج
ایسی ہے کہ اُسے چاہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ وہ ہر وقت اپنی بیوی کی دلجوئی
کا خیال رکھتا ہے۔"

"یہ مانا میرا پولیس مین ایسا نہیں، مگر قمر کی خوش بختی میری خوش بختی ہے۔"
بی مغلانی، میرے دل میں حسد پیدا کرنے کی ناکامیابی سے کچھ کھسیانی سی
ہو کر رہ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد قمر اپنا حسین مگر بھولا چہرہ لئے آ گئی۔ اُس کی
آنکھوں سے، نورِ مسرت کی شعاعیں نکل رہی تھیں جسے دیکھ کر میں نے
خدا کا شکر ادا کیا۔ بی مغلانی کی کوششوں کے باوجود میں اور قمر ایک
دوسرے کو اتنا چاہتے ہیں، ایک دوسرے کو اتنا سمجھتے ہیں کہ ایک دوسرے
کی خوشی و رنج میں پوری طرح شریک ہوتے ہیں۔ اُس دن قمر نے مجھے سنائی۔

رہی کہ تم اُسے کتنا چاہتے ہو۔ میں نے اس محبت کو محسوس کیا؛ ایک صمیمی، عمیق و وفا کار شفقت! تم میری چھوٹی قمر کے آرام کے لئے اپنی شخصیت کو بالکل برطرف کر دیتے ہو۔

اب جو تم گھر میں آئے، تو شاید صبح کی گفتگوؤں کا نتیجہ تھا یا کیا، میں بلا ارادہ، اپنے دل میں اپنی زندگی اور ماجد کا تم سے مقابلہ کرنے لگی۔ مجھے نظر آیا کہ گو ماجد بھی مجھے دیوانہ وار چاہتا ہے مگر اس کی محبت مادّی ہے۔ تمھارا عشق قمر کے ساتھ ایک حمایہ کار، شفاف محبت کی شان لئے ہوئے ہے۔ ان دونوں محبتوں میں مجھے وہ فرق نظر آیا، جو دوزخ اور بہشت میں ہے۔ تم قمر کو اُس کی آرزو کے خلاف گھونٹتے نہیں، ذرا ذرا سی باتوں پر ستاتے نہیں ساتھ ہی اس کے تمھاری محبت میں ماجد کا سا طوفان، جوش و خروش یا مردانہ مشانہ پن نہیں ہے۔ ممکن ہے اس بات پر قمر کی سکون حیات و مسرت منور پر مجھے تھوڑا سا غبطہ ہوا ہو، مگر مجھے اس کی خوشی سے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ میں کہہ سکتی ہوں نہیں ہوا۔ میری زندگی کے لئے تو شاید یہ مقدرات میں سے ہے کہ ہمیشہ وہ طوفان میں سے گزرے۔ مجھے ایسا سکون ملتا جیسا تمھارے گھر میں ہے، یقیناً وہاں بھی طوفان شروع ہو جاتا۔ جیسا میں نے ابھی کہا یہ میرے

مقدرات میں سے ہے۔

قمر میں کس قدر تغیر ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عالی روح اور عالی فکر نے اپنی تمام خصوصیات اُس میں القا کر دی تھیں اور عشق کے موقلم نے اپنا رنگ اُس کے حسن اُس کے فکر میں بکھیر دیا تھا۔ شام کو جس وقت تم آتے اپنے اشعار یا اپنے مجوزہ تصانیف کے خاکے یا قصوں کے پلاٹ ...... سناتے تو وہ سمجھنے والی اور سمجھ کر داد دینے والی نظروں سے تمہیں دیکھتی، تم قمر میں سرتا پا حلول کر گئے تھے، تم بھی قمر کی ہر حرکت کو مشفق و مدقق نظر سے دیکھتے تھے۔ میں بےساختہ اپنے دل میں ماجد کا خیال کئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا "میں تمہارے زلف عنبریں کے ایک ٹوٹے ہوئے بال کے بدلے میں تمہارے سارے افکار و اشعار کو نہ لوں۔"

حالانکہ تم نے قمر کے منور دماغ کے لئے اُس کے معمولی بالوں کی پروا نہیں کی۔ اس کے بعد مجھ میں اور تم میں ایک رابطۂ دوستی شروع ہو گیا۔ اس دوستی کی اس خصوصیت میں کبھی فرق نہ آیا کہ وہ اتحادِ خیالات کی دوستی تھی میں نے اپنے تخیلات و حسیات کی دنیا میں تمہیں اپنا شریک پایا۔ گر یہ تخیلات و حسیات وہ تھے جو دو مرد ایک دوسرے کے متعلق رکھ سکتے ہیں یا ایک دوسرے

سے کہہ سکتے ہیں! ان حیات میں جنس کا عنصر نہ تھا. میری طرف سے اس کا
خاص التزام رہا. میں کہہ سکتی ہوں کہ تمہارے مقابلہ میں میں اپنے چچا زاد بھائی
یا اپنے دیور سے زیادہ آزادی سے گفتگو کرتی تھی. میں نے اپنے دل سے
پوچھا کہ میں تمہارے ساتھ اس قدر احتیاط کیوں برتتی ہوں. مجھے اس کا یقین تھا
کہ تمہاری طرف میرے دل کی کوئی کمزوری نہ تھی. بھلا میں اس کی روادار
ہو سکتی تھی کہ قمر کی آفتاب مسرت کی ضیا پاشی میں کسی ہلکے سے ہلکے بادل کا ٹکڑا
بھی حائل ہو؟ میں زندگی کے ہر قدم پر دیکھ رہی تھی کہ دنیا میں کمیاب مگر محبوب ترین
چیز "وفا" ہے. وہ قابل رشک زندگیاں جو ہر وقت ہالۂ مسرت میں نظر آتی
تھیں، میں نے دیکھا کہ وہ اس عنصر وفا کے فقدان سے گہنا گئیں! مسرتیں غموں میں
تبدیل ہو گئیں. انسانوں کے دماغوں میں داخل ہو کر اگر وہاں کے حالات کا
کشف کرنا ممکن ہوتا تو دیکھا جاتا کہ وہاں کردہ و ناکردہ، متصور و مخیل کیا کیا
بے وفائیاں، ستم آرائیاں چھپی بیٹھی ہیں. مگر میں دیکھ رہی تھی کہ ایک جاہل
بڑھیا کی بے لگام زبان میرے متعلق سرگوشیاں کرانے لگی تھی. اس نے مجھے
اس قدر بزدل کر دیا کہ اگر کوئی مجھ سے تمہارے متعلق ذکر کرتا، تو میں یہ
خیال کرتی کہ وہ جان کر میری تحقیر کر رہا ہے. اور مجھے یہ گمان ہوتا تھا کہ یہ

زہر جو نہ معلوم کہاں سے آ رہا ہے میرے شوہر تک میں سرایت کر رہا ہے، اور جب وہ تمہارا ذکر کرتا تو اس کی نظریں پلٹی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو زمانہ قمر کے گھر میں گزرتا، وہ بھی ان سرگوشیوں کی وجہ سے میرے لئے باعث تکلیف ہوتا۔ میرا وجدان متہم نہ تھا لیکن میں چاہتی تھی کہ ان سرگوشیوں کا خود اس سے ذکر نہ کروں۔ مجھے اطمینان تھا کہ میری چھوٹی بہن میرے گلے میں باہیں ڈال کر مجھ سے کہے گی:

"میں آپ کے اور رشید کے متعلق ان باتوں کا کیسے یقین کر سکتی ہوں"—

پچھلی دفعہ میں تین مہینے رہنے کے ارادے سے لکھنؤ گئی تھی، مگر صرف ڈیڑھ مہینہ رہی کیونکہ تمہارے ہاں رہنے سے مجھے خوف آنے لگا ہے۔ میں اس خوف سے بھاگتی ہوں جو بلاوجہ میرے سر پڑے۔

جس دن ماجد نے مجھ سے ان گمنام خطوں کا ذکر کیا تھا اسے دو ہفتے ہو چکے تھے۔ کہ میں نے رسالے میں تمہاری آخری نظم پر تنقید پڑھی: جو سر تا پا مدحیانہ الفاظ میں تھی۔ تمہاری نظم کے ہزارہا نسخے بک رہے ہیں۔ تمہارے قلم سے وہ نظم نکلی تھی جس نے ایک شاندار مظفریت کے ساتھ تمہیں اقلیم سخن کا تاجدار بنا دیا۔ مگر مجھے اس نظم کی غیر معمولی کامیابی اور اپنی مصیبت میں ایک رابطہ

نظر آرہا ہے۔ اگر تم ایک معمولی آدمی ہوتے تو اس تہمت کو جو اگر واقعیت بھی رکھتی ہوتی، مرور زمانہ بھلا دیتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا نام کسی بڑے شاعر سے، جھوٹا یا سچ کسی طرح مربوط ہو جائے، وہ ادبیات کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہتا ہے۔ غرض کہ میں یہ خیال کر کے کانپ اٹھتی تھی کہ باوجودیکہ میں بے گناہ ہوں آئندہ نسلیں مجھے اس ناپاک تہمت کے ساتھ یاد کریں گی۔ غالباً تمھاری یہ شاندار کامیابی، ناکام شاعروں کے شعلۂ حسد کو بھڑکائے گی، اور وہ تمھاری زندگی کو داغدار بنانے کے لئے ہمیشہ اس کا ذکر کریں گے۔ اور گھر کی یہ بے بنیاد بے سر و پا باتیں ان کے ہاتھ لگ کر تمھیں ملوث کرنے کے لئے شوق سے استعمال کی جائیں گی۔ بہت ممکن ہے کہ ماجد کے نام جو گمنام خطوط آئے، ان کے لکھنے والے بھی ذکی الطبع حاسد ہوں۔

میری بچی سو رہی تھی، میں نے اس کے ریشمی بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ کے حضور قلب کے ساتھ خدا کی درگاہ میں دیر تک دعا مانگی کہ وہ یہ اتہام میرے سر سے اٹھا لے۔ اس رات، کلب میں ایک دعوت تھی۔ ماجد اس میں گیا تھا اور یہ معلوم تھا کہ وہ دیر میں آئے گا۔ اس لئے میں سونے کے لئے لیٹ چکی تھی اور تھوڑی دیر بعد گہری نیند میں چلی گئی تھی۔

رات آدھی گزری ہوگی۔ مجھے اک کرب سا محسوس ہوا اور میں جاگ گئی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ ماجد جس کا چہرہ زرد ہے، آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہیں ہونٹ غصے سے کانپ رہے ہیں، جھکا ہوا میرے چہرے کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے منہ سے شراب کی جھپک آرہی ہے۔ میں کانپتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ ماجد جس نے کبھی شراب نہ پی تھی آج کیوں شراب میں دھت تھا۔ وہ آج غیر معمولی طور پر خوش خوش گیا تھا یکایک اس میں ایسا تغیر کیوں ہوگیا۔ نہایت برے اور اکھڑ طریقے سے اس نے ایک خنجر کو جسے وہ ایک ہاتھ میں لئے اور کمر پر رکھے ہوئے چھپائے ہوئے تھا اب دکھانا شروع کیا اور کہنے لگا: "میں لایا تھا بجلی کے لئے (بجلی، ایک بازاری عورت کا نام تھا جس کے ساتھ اس نے بیاہ سے پہلے محبت کی تھی؛ یہ نام اب اس نے اپنی چہیتی گھوڑی کو دے رکھا تھا) مگر یہ نصیب میں کسی اور کے تھا۔"

میرا غرور سمٹ کر جمع ہوگیا، اور میں سیدھی ہو بیٹھی اور میں نے اس آواز سے جس میں استخفاف اور جرأت دونوں ملی ہوئی تھیں پوچھا: "مجھے مارو گے؟"

"ہاں"

"کس حق سے؟"

"اس حق سے کہ تم اپنی عصمت کھو بیٹھیں، اور انسانیت کے درجے سے نیچے گر گئیں"۔

میں نے غصے سے چلّا کر کہا: "جھوٹا، مفتری"۔

اس پر یکایک ماجد اک قدم پیچھے ہٹا، اور نرم آواز سے کہنے لگا:

"کیا تم قسم کھا سکتی ہو کہ رشید سے تمہارا کوئی تعلق نہیں؟"

اس کمینے سوال پر، میں اپنے توازن طبیعت کو کھو بیٹھی۔ یہ بے اعتباری اس شخص کی طرف سے جس کے حق میں میں نے تیرہ برس کی طویل مدت میں کوئی چھوٹی سی چھوٹی ایسی حرکت نہیں کی جو بے وفائی کہلائی جا سکے، مجھے پاگل کئے دیتی تھی۔ میں نے جواب دیا:

"میں ہرگز قسم نہ کھاؤں گی۔ جس عورت کو تم اس قدر رذیل سمجھتے ہو، اس سے بات ہی کیوں کرتے ہو؟ کہاں ہے تمہاری تلوار اور بندوق؟"

اس نے کہا: "اب بھی غرور!" اور یہ کہکے اور ایک عجیب غرغراہٹ کی آواز گلے سے نکال کے اس نے میرے سر کے بالوں کو پکڑا اور مجھے کھینچا، میں نے دیکھا کہ اس نے ہنٹر کو اٹھایا۔ میں درد سے تو ڈرتی نہیں، مگر میری عزتِ نفس جسے بچپن سے میں نے بڑے اہتمام سے پالا پوسا تھا اور آسمان تک

بلند کیا تھا۔ اس وقت اس قدر مجروح تھی کہ عین اس لمحہ میں جب مجھ پر شڑاق شڑاق ہنٹر پڑ رہے تھے اور میری کھال اُدھڑ رہی تھی، میں چاہتی تھی کہ اس مار کی تکلیف زیادہ ہوتا کہ میرے عزتِ نفس کے پامال ہونے کی تکلیف اس میں دب جائے۔

ماجد حیران تھا کہ وہ عورت جو معمولی درد سر کی تکلیف میں چیخ اٹھتی تھی کس عناد و تکبر کے ساتھ اس مار کو خاموشی سے سہہ رہی تھی۔ اُس نے اور زور سے مارنا شروع کیا۔ اُس درد سے جو میرے شانے سے دوڑتا ہوا میرے قلب تک گیا، آخرکار بیتاب ہو کر میں بے ہوش ہو گئی اور نہ معلوم کتنی مدت تک میں اس حالت میں فرش پر پڑی رہی کہ میرے شانوں سے اور پیٹھ سے خون بہ رہا تھا۔ سکوتِ شب کو ریوالور کے چلنے کی سخت دھماکے نے توڑا، اور میں نے آنکھیں کھولیں۔ ماجد سپاہی نفس ہونے کی اس صفت کے ساتھ جس سے وہ ہمیشہ متصف رہا تھا۔ زمین پر پڑا ہوا تھا ریوالور کی گولی ایک کنپٹی سے دوسری کنپٹی میں نکل گئی تھی۔

اس کے بعد کا حال تمھیں معلوم ہو گیا ہوگا؟ ماجد کے ہاتھ میں ایک گمنام خط پایا گیا جس میں میرے اور تمھارے تعلقات کی نسبت بہت کچھ زہر

اُگلا گیا تھا یعنی یہ کہ میں جو اچانک لکھنؤ سے بھاگ آئی وہ اس لئے تھا کہ ماجد کو ہمارے تعلقات کی خبر نہ ہو جائے، اس خط نے تہمتوں کو اسی پر بس نہیں کیا۔ شادی کے آٹھ برس بعد تک میرے کوئی بچہ نہ ہونا، اور قمر کے بیاہ کے بعد میرے اولاد ہونا ...... الٰہی توبہ! الٰہی توبہ، میں نہیں لکھ سکتی۔ یہ ملعون قلم، کیا کسی قاتل کے خنجر سے زیادہ کاٹ کرنے والا نہ تھا؟ ایک ایسے دماغ کے لئے جو مہینوں سے شبہات میں مبتلا تھا، کیا یہ دلائل کافی نہ تھے؟ تھوڑے ہی زمانے میں میری بدنامی پھیل ہی گئی۔ ہر شخص نے ماجد کے ساتھ ہمدردی کی۔ اس کے جنازے پر سارا شہر آیا، اور ہر شخص نے مجھ پر لعنت کی۔

جو زندگی میں جیسا میرے ساتھ رہا سو رہا، مرتے وقت بھی میرے ساتھ برائی کر گیا۔ میرے ساتھ کسی نے وفا نہیں کی، مگر میں نے اپنی ہر حرکت اور ہر بات میں وفادار و راست باز رہنے کی کوشش کی۔ اس کا عوض مجھے یہ ملا کہ جس شخص پر میں نے اپنی عمر کے بہترین تیرہ برس قربان کر دیئے اس نے مجھ پر اعتبار نہ کیا اور تا ابد مجھے رسوا کیا۔ جو آدمی میرا اتنا محرم تھا، جب اس نے ہی میری بات پر یقین نہ کیا اور اس حد تک یقین نہ کیا کہ اپنے سر میں گولی مار لی، تو اب اور کون یقین کرے گا؟ اس خودکشی نے شبہ کو قطعیت، مطلقیت کا

درج دے دیا۔ اب کون اسے روک سکتا ہے کہ تاریخ میں میرا نام اس طرح درج ہو کہ یہ وہ ننگ ناموس عورت تھی جس نے اپنی بہن کے ساتھ بے وفائی کی اگرچہ یہ کہکر خودکشی کرتا کہ میں اپنے چچا کے بیٹے یا اور کسی کو چاہتی ہوں تو بھی میں عمر بھر کے لئے رسوا اور بدنام ہوتی۔ مگر اب شاعر بے ہمتا رشید کی سوانح عمری لکھنے والے لکھیں گے کہ اُس کی بیوی کی بہن نے اُس کے ساتھ عشق کیا، اور اس بنا پر اس کے خاوند نے خودکشی کی۔ اسے ایک واقعہ دے کر بہت کچھ رنگ آمیزیاں کی جائیں گی۔ لوگ تمھیں معذور خیال کریں گے مگر مجھے مسئول۔ الٰہی، میں نے کونسا ایسا گناہ کیا جس کے پاداش میں ایسے خوفناک افترا و بہتان پر بھینٹ چڑھائی جا رہی ہوں۔ مگر ایک بے پروا اور میرا مضحکہ اُڑانے والا مقدر کہتا ہے کہ ہاں تجھ پر ہمیشہ ہمیشہ یہ بہتان بیٹھے گا۔ آہ! اب مجھ میں نہ اس کی جرأت نہ اس کی آرزو کہ میں لکھنؤ آؤں۔ میں اس سوسائٹی سے جو مجھے اُس گناہ پر جس کی میں مرتکب نہیں ہوں ملعون قرار دیتی ہے میری زندگی کو برباد کرتی ہے، دور بھاگنا چاہتی ہوں اپنی زندگی، اپنی بدبخت بچی کے ساتھ کسی نامعلوم گوشے میں جاکر بسر کروں گی۔ کسی کو خبر نہ ہوگی کہ میں کہاں چلی گئی۔ میری بچی جب جوان ہوگی

اس وقت میں اُسے سب حال بتاؤں گی، مگر تم سب مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ میں ایک راز ایک معاہن کر غائب ہو جاؤں گی اور میرے لئے کسی کی آنکھ سے نہ ایک قطرہ آنسو کا نکلے گا اور نہ کسی ہونٹ سے ایک کلمۂ افسوس۔ عزیز و اقربا جان پہچان والے سب ہمیشہ لعنت ہی بھیجیں گے۔

جن جن کو میں پیچھے چھوڑ رہی ہوں، ان میں صرف تم ہی ہو جسے میری بے گناہی کا علم ہے مگر اُس بے گناہی کو ثابت کرنے کا اقتدار نہیں۔ میں اب بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے یہ خط تمھیں کیوں لکھا۔ مگر تم سے التجا کرتی ہوں کہ اس خط کو قمر کو مت دکھانا۔ کیوں کہ مجھے خوف ہے کہ جس بہتان پر سارا خاندان یقین کر رہا ہے، شاید وہ بھی یقین کرنے لگی ہو۔ میں اُسے معاف کرتی ہوں۔ دیکھو، مجھے اس خیال سے تسلی ہوتی ہے کہ میری اکلوتی بہن کی زندگی کی خوشی تمھارے ہاتھ میں ہے۔ میری عزت نفس قبول نہیں کرتی کہ تمھارے سوا اور کسی کو اپنی بے گناہی منوانے کے لئے کچھ لکھوں، مگر ہاں یہ حسرت ضرور اپنے ساتھ لئے جاتی ہوں کہ اگر میری طرف سے میری بہن کے دل میں غلط خیالات جاگزیں ہو گئے ہیں وہ دور ہو جاتے۔

میں تمھیں یہ لکھ رہی ہوں کہ مجھے سمجھنے والے صرف تم ملے ہو۔ تم کہ میرا

تمھارا کوئی ساتھ نہیں رہا تم نے مجھے اُس آدمی سے زیادہ پہچانا جس کے
ساتھ میں نے تیرہ برس گزارے۔ کیا تمھارا ایمان نہیں ہے کہ مجھ سے ایسی حرکت
سرزد نہیں ہو سکتی؟ میری سیاہ روح میں اب صرف یہی ایک منور نقطہ ہے:
کہ جب ساری دنیا مجھے ملوث خیال کر رہی تھی تم جانتے تھے کہ میں بے گناہ و
پاک ہوں۔ اک دن میری بیٹی بھی اسے جانے گی۔

تم سے میری اک آخری التجا اور ہے: اسے ایک بیاہی ہوئی عورت کی
آخری آرزو سمجھ کر سنو! تم متاذی و مضطرب ہو کہ اس مصیبت کے سبب تم
ہوئے جس نے مجھ پر وہ داغ لگایا جو اَب دُھل نہیں سکتا اور جو مجھے دائمی
جلاوطنی میں بھیج رہی ہے۔ مگر میری آرزو ہے کہ میرا نام تمھارے لئے اک عذاب
اک تاسف نہ ہو۔ بس میں تم سے اس قدر آرزو رکھتی ہوں کہ جب تم میرا نام
لو تو یہ خیال کرو کہ میں وہ ہوں جس نے جنس نسواں میں تمھیں اور تمھارے
کلام کو سب سے بہتر سمجھا۔

یقین مانو کہ زندگی مصیبتوں میں کاٹنے، پھر بھی زندہ رہنے کی ہمت
مجھ میں صرف ایک وجہ سے ہے: میری لڑکی!

تاریخ تو مجھے کیا کچھ کہکر یاد کرے گی، مگر تم جب میرا خیال کرنا تو یہ خیال

کرنا کہ تمھاری اک ہی خیرخواہ ہے جو انتہائے بعید سے تمھاری کوششوں، تمھاری کامیابیوں، تمھاری خوشیوں کو دیکھ رہی ہے اور تمھارے لئے سعادتِ دین و دنیا کے حصول کی دعا کر رہی ہے۔ کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا؟

بزمِ رفتگاں

(اسکندریہ کے میوزیم میں چند گھنٹے)

ہم سنگِ مرمر کے چوڑے زینے سے اوپر پہنچے ہی تھے کہ اک مرمر کی شہ نشیں ہمیں ملی۔ دن گرم تھا۔ چھت کے ٹھنڈے سایہ میں پہنچنے کے لیے ہمارے تیز قدم مرمر کے فرش پر جلد جلد پڑ رہے تھے جن کی وجہ سے فرش سے آواز نکل رہی تھی۔ یہ آوازیں جو اُن چوڑے دروازوں میں سے گزر کر جو اک دوسرے کے مقابل میں کھلے ہوئے تھے، وسیع کمروں میں عکسِ صدا پیدا کرتی تھیں اور ان آوازوں کی وجہ سے، اور ان سے زیادہ اُن کمروں میں دورِ خاموش مگر معنی دار عظمت کے ساتھ ان آوازوں کو سننے والے سنگین بتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہوا میں مُردوں کے سائے پھر رہے ہیں اور اس سے ہمارے اوپر اک مبہم خوف طاری ہوتا تھا۔ بالآخر ہم اُن کمروں میں پہنچے جہاں دن کی روشنی بھی مدہم ہو کر پہنچتی تھی، جہاں خاموشیِ مطلق طاری تھی۔ یہاں ہم ماضی اور ماضی کے ساکنوں کے سامنے تھے۔

ہم جب مزاروں میں سے گزرتے ہیں، تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت
جو نہ معلوم ابھی اور کتنی اونچی پرواز کرے گی، پر شکستہ ہو گئی۔ ہماری قابلیت
نمو سر تسلیم خم کئے ہوئے نظر آتی ہے۔ ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ فطرت جو ہر
چیز کو فنا کی مملکت میں لیئے جا رہی ہے، ہمیں بھی اپنے تاریک پردوں میں لپیٹ
رہی ہے۔ اک دن، دس دن، اک سال، دس سال، مختصر یہ کہ اک مدت
مدید بھی جس کے لیے ایک لمحہ ہے، وہ فطرت ہم کو عدم کی طرف گھسیٹے لیے جا رہی
ہے۔ یہ حس میوزیم میں جاکے اور زیادہ قوت حاصل کر لیتا ہے۔ وہاں ہم کو احساس
ہوتا ہے کہ بشریت کے تمام مظاہر، ان کے تجلیات ظاہری و معنوی، ان کے
عشق، ان کی روح، ان کی صنعت، غرض کہ ان کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے
نمونے جنھیں انھوں نے سنگ تراشی کے ذریعے قائم و دائم رکھنا چاہا ہے، وہ
بھی دفن ہو جائیں گے۔ تنہا وہی نہیں، بلکہ اپنی ملت، اپنی تہذیب و مدنیت کے
ساتھ زیر زمین چلے جائیںگے۔ نہ مرنے کے لیے انسان کی بھی کس قدر مصرانہ، کس قدر
درد انگیز، کس قدر تمسخر آمیز کوششیں ہیں! ہمیں قبر اس خیال سے ڈراتی ہے
کہ ہم فنا ہو جائیں گے، لیکن یہ ہمارے افکار و آثار کی زینت ہوںگے اور دنیا
کوشش سے اور شوق سے انھیں قائم رکھے گی، یہ خیال ہمارے فکر و روح کے

پوشیدہ ترین غرور، حسّاس ترین نقطۂ قلب کو خوش کرتا ہے۔ میرے قریب ماضی کی حسین تکمیں جو پتھر نے ہم تک پہنچائیں ٹوٹی پھوٹی پڑی تھیں۔ اُن کی زنجیریں زندگی کے لوازمات کے متعلق آن کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بکھری ہوئی تھیں ہیں اُن میں بھر رہی تھی، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس خاموش مقام میں ان بے جان سنگین انسانوں کے ہونٹوں پہ ایک تبسم تھا جس سے یہ معلوم ہو تھا کہ وہ تبسم اگر نوازش کا راز ہے، تو تھوڑا سا تمسخر بھی ہے، یعنی ماضی کے یہ انسان ہم نئے انسانوں پر اک خندۂ زیرلب سے نظر ڈال رہے تھے۔ یہ کیا سوچ رہے ہیں، یہ کیا کر رہے ہیں؟ معمائے حیات، سرِ حیات جنھیں ہم نہ جان سکے، کیا یہ انھیں جانتے ہیں؟ اسے آن سے پوچھیئے، اُن سے سمجھنے کے لیے میرا کس قدر دل چاہتا ہے! مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی جانتی ہوں کہ ان کی زندگیاں، خواہ ہیچ ہوں، خواہ اک نورِ صمدانی سے منور، کچھ بھی ہوں ان میں شریک ہونے کے لیے مطلقاً اُن جیسا ہونا پڑے گا۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ یہی کہیں گے کہ "ہم بھی اک وقت جب انسان تھے، تو تمھاری ہی طرح روئے ہنسے، عاشق ہوئے، نفرتیں کیں"؛ مگر کیسے پوچھوں؟

اُدھر خشمناک چہرے اور قہارانہ وجبارانہ انداز سے ہونٹ بنائے ہوئے

شہنشاہ اڈریان پڑا ہوا ہے؛ اِدھر اپنے حسنِ سماوی کی وجہ سے مغرور اور
اپنی قدردانوں سے دُور، اک اپولو کھڑا ہے۔ اک ستون پر اک موٹا تازہ
بچہ اپنے ہاتھ پر سر رکھے سو رہا ہے۔ اک طرف اک مقدس برہنی بوگا انسانوں
کے زیور کو اپنے نعلوں کے نیچے میں رہا ہے، غرض کہ جوان، بڈھے، مرد،
عورت، دیوتا، اپنی خوبصورتی، اپنی بدصورتی کو لیے ہوئے، جس سے انھوں
نے دنیا کو اک رنگ خاص دیا اور اپنی شہرت اور افسانوں اور روایتوں
سے زندگی کو منور کیا، سنگین بتوں میں کہیں بگڑے ہوئے ناراض چہرہ
لیے ہوئے، کہیں خوش و خنداں کھڑے تھے، کہیں کسی کمرے میں نفیس
و نازک زیوروں میں لدے ہوئے، ستارانہ چمک رہے تھے۔ نہ معلوم انھوں نے
کن حوصلہ، احتراصات میں گھڑیاں گزاری ہیں؛ نہ معلوم کس قدر عشق کی سازشیں
کی ہیں؛ نہ معلوم کن حسین آنکھوں کے سب سے زیادہ جاذب تبسموں کو اپنی طرف
مائل کیا ہے؛ نہ معلوم کتنے اُن قدموں کو جنھوں نے راہِ راست پر چلنے کا عزم
بالجزم کر رکھا تھا، ڈگمگا دیا ہے۔

ہم اک کمرے میں داخل ہوئے جس کے سنہری قبے سے آفتاب کی طلائی
شعاعیں پڑ رہی تھیں خدمتگاروں نے جو ہماری حیرت کے منتظر معلوم ہوتے

تھے۔ مسٹر خ نے پردہ اٹھایا، اس کمرے میں خوبصورت عورتوں کے سنگین بت اک
قطار میں کھڑے تھے۔ یہ زبانِ خاموشی سے مصروفِ مکالمہ تھیں۔ یہ شریف لبر
و دلربا قدیم روما کے حسین، اپنے بالوں کے نفیس تموج، اپنے چہرے کی متکبرانہ
نظر، اپنی جاکٹوں کی چھوٹی سے چھوٹی شکنوں میں دو ہزار سال پہلے کے تقدم
و عظمت کو اب تک قائم رکھے ہوئے تھے۔ ان کے بالوں کی سُرخی مائل لہروں
کو، اُن کی جاکٹوں کے چمکدار رنگوں کو صدیوں نے خراب نہ کیا تھا بلکہ اُن میں
اک اور زیادہ صوفیانہ پن پیدا کر دیا تھا۔ ان پر اک شاندار اور شاہانہ سایہ
پڑ رہا تھا۔ ہم نے جب یہ کہا کہ "یہ تو سارے میوزیم سے زیادہ قیمتی ہیں" تو خود منگولڈ
نے مسخرانہ و مغرورانہ انداز سے، اوپر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان سے
بھی زیادہ قیمتی چیزیں وہاں ہیں"۔ اک کمرے میں ایک منقش مدور مرمر کا حمام
رکھا ہوا تھا۔ جس کے گرد زنجیروں سے محافظت کے لیے احاطہ بنایا گیا تھا۔ میرے
سوال پر "کلیوپیٹرا کا حمام" کہا گیا۔ اس فقرے پر میری روح کی گہرائیوں میں
سے اک لرزش پیدا ہوئی۔ نیل گوں نیل، سبز خرما کی شاخوں اور حرارت آور فضا
کی یہ عفیفی ملکہ کتنے تاجدار سروں، کتنے شاہانہ دلوں، کتنی دیوانہ وار پرستشوں
کی مالک رہ چکی تھی! اس حمام کے اوپر گنبد کے شیشوں میں سے آفتاب کا نور

طلائی ذرہ ہائے خاک میں سے گزر کر آ رہا تھا۔ اس نے اک نورانی ستون کی شکل
اختیار کر لی تھی جس میں ذرے اک نورِ متحرک بن کر رقص کر رہے تھے۔ میرا ذہن
دُنیا کے اُس بزرگ ترین ماجرائے عشق کی طرف منتقل ہوا، اور میں بہت دیر
تک نہ فہ استغراق میں رہی۔ میری آنکھیں اُس ذراتِ ضیا کے نورانی رقص
پر گڑی ہوئی تھیں نہ مگر وہاں سے مجھے موت نے نہیں، عشق نے لبیک کہا۔
روشنی کے ان ذرات میں اک سفید و منور غبار نے اک عورت کی شکل اختیار
کی جو کلیوپٹرا کے حمام سے بلند ہو رہی تھی۔ اس نورِ جاری میں اک اثیری
شکل جسے چشمِ دل محسوس کرتی تھی، اُٹھتی نظر آتی تھی۔ اُس کے سیاہ لہراتے
ہوئے بال اک سنہرے ریشمی فیتے میں بندھے ہوئے تھے۔ اُس کے عریاں اور
حسین شانے نازک و خیانت کار متوجات سے اوپر کی طرف مائل تھے۔ اس کا عشوہ
آفرین شباب، جس میں ایک صنعت کار کی روح نفوذ کئے ہوئے تھی، ایک باریک
قمیص سے اُس کے جسم کے تمام جادو، تمام قدرتِ بے اماں کو ظاہر کر رہا تھا
اس تصویر کو اُس منور ذروں کی چادر میں میں نے دیکھا۔ اس کے عارضِ گلگوں
جن میں ناقابلِ بیان نرماہٹ تھی جن میں نہایت دلکش خد اند خطوطِ تبسم پیدا
ہوتے تھے، اک سُرخ و سفید ٹھوڑی پر جا کر ختم ہوتے تھے۔ اِن کی کشش کا

انسان مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کی پیشانی کے نیچے، دو ابرؤوں کی تلواریں تھیں جو اُس نگہت کی (جو اپنی بادامی آنکھوں کے لیے دنیا میں مشہور ہے) دو بہترین بادامی آنکھوں پر سایہ افگن تھیں۔ یہ آنکھیں، یہ وہ بدیع و مشتاق آنکھیں تھیں جن کی مثال دنیا نے دوسری دفعہ نہ دیکھی۔ میں ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن اتنا میں جانتی ہوں کہ اس کی آنکھوں میں اک آتش، اک حیات سیالؔ مشتعل تھی۔ یہ ضیاءِ مطاہر روشنیِ سیال اُس مہلک عشق کے اسرار احساسات کی نور پاشی کر رہی تھی جس نے اک نیاز آگیں، نوازش آگیں، سحر کار، مگر متحکم عورت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس زرّین اور متحرک چادر کے نیچے سے جو آفتاب کی سنہری شعاعوں نے بنا رکھی تھی، وہ اپنے بازو دعوت کار طریقے سے اُٹھا کر اپنی شیریں آواز سے کہہ رہی تھی:-

"مارکس انٹونیس! میرے ہونٹوں میں ابدیت، میری آنکھوں میں جنت ہے"

ہم آخر میوزیم کے خاص ہال تک پہنچے۔ جو خدمتگار ہمیں سیر کرا رہا تھا۔ اُس نے بے پروایانہ طریقے سے چند شیشے کے بکسوں کو دکھا کر کہا "ان میں مومیائیاں ہیں"۔ یہ چیز جس کو کچھ اہمیت نہ دی گئی تھی، میری جنس کی حقیقی بقیہ یادگار تھی۔ اُس کے قریب پہنچتے ہی میں گویا زمین میں جکڑ دی گئی۔ یہ تھیں!

اور اُن کی زینتیں، سب خیالی، وہمی چیزیں ہو سکتی ہیں، مگر یہ! انسانی گوشت اور ہڈیوں کے ٹکڑے! یہ، ہمارے گزشتہ کل والوں کے تمثالِ شخصی! وہ تصور جو فنا کے خیال سے گریز کرتا ہے، اس کو دیکھ کر فرار کے دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں۔ ہمارا عجز، ہماری بیچارگی، برہنہ اور عریاں حالت میں، ہمارے سامنے نظر آتی ہے۔ شفقت و ترحم آمیز حرمت کے ساتھ میں آگے بڑھی، اور میں نے ہر صندوق کے اندر نظر ڈالی۔ اس نظر میں تجسس و حیرت نہ تھی۔ میری نظر ماضی میں نفوذ کرنا ان بچے ہوئے انسانوں کی ہڈیوں سے اپنا اک نقطۂ ارتباط پیدا کرنا چاہتی تھی۔ پہلا صندوق اونچا اور چوڑا تھا۔ اُس میں تین مومیائیاں تھیں جن کے کپڑے بوسیدہ ہو گئے تھے، گوشت خشک تھے، ہڈیاں بھی خاک ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اک بہت لمبا مرد اپنے دونوں بازو جسم سے ملائے ہوئے پڑا تھا۔ اس کے قریب اک عورت، مرد کے بازوؤں پر سر رکھے، اپنے سُرخ بال پھیلائے لیٹی ہوئی تھی اس کے خشک چہرے میں گہری نیند اور خوشی کے علائم نمودار تھے۔ ان کے بعد مگر ان کے ہی پہلو میں، اک ننا منا سا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ میرے دل میں اس مسرت و سعادتِ جسم کے مقابلے میں تھوڑی سی رقت، مگر اس سے زیادہ حسد پیدا ہوا! اپنے خوابِ مسرت کو تا ابد اپنی ہڈیوں کی راکھ میں لانے والے اس

جوڑے نے زندگی کے انتہائے انبساط اور مقصودِ الفت کو یہاں تک پہنچایا تھا۔ اپنے شریکِ حیات، اپنے ثمرۂ حیات کے ساتھ، وہ یہاں لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے اجزا، ایک دوسرے سے مل رہے تھے اور ان ہڈیوں سے جو یہاں خوابِ راحت میں تھیں، ان تین انسانوں کی ہڈیوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سب کچھ عیاں تھا۔ میں نے اپنا سر ان کے سامنے خم کیا، اور میں آگے بڑھ گئی۔ مُردوں میں بھی زندوں کی طرح شخصیت والے اور غیر شخصیت والے ہوتے ہیں۔ مُردوں کے اس جمِ غفیر میں مجھے اک چہرہ نظر آیا جو اس وقت بھی مضطرب تھا، جس کے اعصاب سے تشنج ہویدا، جس کی جبیں پُر چیں یہ جس کی آنکھوں میں اضطراب تھا۔ یہ بیزنیٹم (قسطنطنیۂ قدیم) کا اک پوپ تھا۔ شاید اپنے بیمار اعصاب کو راحت پہنچانے کے لیے مصر کے بیابان و ریگستان میں گھسٹتا گھسٹتا آیا ہوگا، موت میں بھی اس کی مریض روح، اس کی شکنوں کو نہ ہٹا سکی۔ سب سے آخر میں نظر روما کی اک عورت کی مومیائی پہ پڑی۔ اپنی اوڑھنی کے نیچے، اُس کے چہرے کے بلیغ و معنی آفریں خطوط نہ معلوم کتنے سو برس سے قائم تھے۔ اُس کے خوبصورت چھوٹے پاؤں کے ناخنوں پر (شاید یہ اک نشانِ عالی خاندانی ہوگا) سونے کے خول چڑھے ہوئے تھے۔

اُس کے دل کش چہرے میں اُس کی بڑی بڑی آنکھیں، اُس کے بھرے ہوئے ہونٹ، اس کی ستواں ناک عیاں بتا رہے تھے کہ وہ اک حسین عورت تھی۔ اُس کے سینہ کی تناہا نہ گولائی، اُس کی اوڑھنی کے نیچے بگڑنا شروع ہو گئی تھی۔ صندوق کے شیشے پر ٹکٹکی لگا کر میں دیر تک اس کے جسم کو دیکھتی رہی اور اس کے جسم کی ہیت کذائی میں نفوذ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ میری آنکھیں جو دیکھتے دیکھتے تھک گئی تھیں، انھیں ایسا معلوم ہوا کہ اس عمیق سکون میں اک حرکت پیدا ہوئی؛ اس کی بڑی بڑی آنکھوں نے اک دوستانہ تبسم سے مجھے دیکھا۔ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟ کیا مجھے کسی طول طویل لطفِ مکالمہ کا نیوتہ دے رہی ہے؟

میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ کیا تھا۔ کیا یہ اک خواب تھا؟ چاروں طرف تاریکی تھی۔ میں میوزیم کے چوڑے زینے سے جا رہی تھی کہ مجھے اس قدیم روما کی عورت نے بلایا اور میں اس کی طرف گئی۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھتا کہ "تم کس سے ملنے جا رہی ہو؟" تو میں کیا کہوں گی؟ کیوں کہ میں اس کا نام بھی نہ جانتی تھی، مگر نہ معلوم کیوں، مجھ سے کسی نے کچھ سوال نہیں کیا۔ کیا اس بزمِ رنگان میں جب صحبت مکالمہ شروع ہوئی، تو میوزیم کے خدام سو گئے تھے؟ اور نہ بھی

سو گئے تھے تو وہ کر کیا سکتے تھے؟ اس پُر اسرار گفتگو کو وہ سمجھ سکتے تھے، اور اس میں کیا مداخلت کر سکتے تھے؟ اس تاریکی میں مجھے معلوم ہوا کہ کئی جسموں کو حرکت ہوئی؛ گفتگوئیں شروع ہوئیں، لمبی، گہری گفتگوئیں شروع ہوئیں۔ مجھے اک ہاتھ بڑے دروازے تک کھینچے لے گیا۔ میں اُس صندوق تک پہنچی جسے میں نے دن میں دیکھا تھا۔ میرے قدم وہاں گڑ گئے۔ صندوق میں اک حرکت پیدا ہوئی اُس میں سے اک آواز آہستہ آہستہ نکلی جو کہہ رہی تھی:۔

"میرا نام لکریشیا ہے۔ شہنشاہ اڈریان کے زمانے میں اسکندریہ کا جو حاکم تھا، میں اس کی ہمشیر زادی ہوں۔ میں خوبصورت تھی؟"

بےشک، میں اُس زمانہ کی سب سے زیادہ حسین عورت تھی۔ میرا ماموں مجھسے کہا کرتا تھا کہ یہیں نہیں، روما میں بھی تو حسین عورتوں کی سردار ہوگی، مگر روما تک جانے کی ضرورت ہی نہ پیش آئی شہنشاہ اور شہنشاہ بیگم مع اپنے رفقا کے افریقہ کی سیاحت کو تشریف لائے ہم نے کیسی شاندار، گریزہ، تخیل آفریں دعوتوں، ضیافتوں، کھیل تماشوں سے اُن کا استقبال کیا! یہ میرے لیے اک بڑی کامیابی کی ابتدا تھی۔ روما کے وزیرزادے، امیرزادے میری آنکھوں کے

سحر کے مقابلہ میں اپنا ثبات و متانت کھو بیٹھے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک
اک اک کر کے، میرے حسن کی فتراک کا اسیر ہو گیا۔ دو اک نے تو انتہائے
یاس میں خودکشی تک کر لی۔ ولی عہد انٹونیس کا یہ حال تھا کہ بوقت نوکر
کی طرح میری خدمت میں حاضر رہتا۔ شہنشاہ بیگم نے مجھ پر لطف و
نوازش کی بوچھار کر دی اور مجھے اپنی خاص معزز خواصوں کے زمرے
میں داخل کر لیا۔ آہ! کیا شان تھی، کیا شہرت تھی، کیا دبدبہ و
طنطنہ تھا، کیا دن تھے! اسکندریہ سے لے کر روما تک میرے
حسن کا آوازہ پہنچ گیا تھا۔ لیکن ایک دن! اک دن شہنشاہ کے
حضور میں میں نے اک نوجوان کو دیکھا۔ مجھے اس وقت معلوم
ہوا کہ اپولو دنیا میں اُتر آیا ہے اور اس کی محبت کا شعلہ میرے
دل میں اس قدر بھڑکا کہ شہنشاہ اڈریان کی بندگی، جس نے اپنے
تئیں روما کے دیوتاؤں میں داخل کر دیا تھا، میں نے پس پشت
ڈال دی۔ میرا تاجِ مظفریت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اک نوجوان
کے قدموں کے نیچے بکھرا ہوا پڑا تھا۔ اس زمانے کی تصویر آپ
میں سے ایک شخص نے اپنی کتاب میں کھینچی ہے نا؟ میں نے اس

برفانی مگر حسین شخص کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے کیا کیا کچھ نہ کیا۔
میں نے اُس عظمت کو جو روما کی عورتوں کے نزدیک سب سے
زیادہ مقدس ہے پامال کیا، لیکن وہ کبھی اک منٹ، اک سکنڈ کے
لیے اپنی حسین آنکھوں کی تھکی ہوئی نظریں مجھ پر نہ ڈالتا تھا، مجھ سے
بعید، لوگوں نے کہا کہ وہ یونان کی اک بدشکل اور لنگڑی لڑکی
پر عاشق ہے۔"

یہاں اس کی آواز بھرائی تھی، مگر اس میں یادِ ایام کے ساتھ اشتیاق
شامل تھا۔ کمرے میں اوروں کا مکالمہ جاری تھا، وہ کہے گئی:۔

"اک دن شہنشاہ بیگم نے مجھے شہنشاہ کے پاس کوئی بات دریافت
کرنے کے لیے بھیجا، بادشاہ اکثر راتوں کو ستارہ بینی کیا کرتا تھا۔
دربان نے مجھ سے کہا کہ بادشاہ سلامت اس وقت رصدگاہ کے
منارہ میں ہیں، اور اُن کے ساتھ اُن کا ندیم خاص انٹونیو ہے؛
میرے دل میں اک خیال آیا جس کی لذت نے مجھے مست کر دیا
میں نے کہا میرے ہاتھ میں اک کاغذ ہے، اور ملکہ کا حکم ہے کہ میں
اس کاغذ کو بادشاہ کے ہاتھ میں خود پہنچاؤں؛ دربان نے مجھے

راستہ دے دیا۔

کمرے کی نیم تاریکی میں بادشاہ کی کوچ پر جس پر چیتے کی کھال بچھی ہوئی تھی، انتونیئس دراز تھا، اور اپنے حسین چہرے کو دلربایانہ انداز سے اپنے بازو پر رکھے ہوئے سو رہا تھا۔ اس وقت مجھے قطعی طور پر یہ محسوس ہوا کہ اپولو نے اس نوجوان کے جسم میں جنم لیا ہے۔ اس مرمر کے خالی کمرے میں میں گھٹنوں کے بل آہستہ آہستہ چل کے نہایت خاموشی کے ساتھ اُس تک پہنچی۔ میرے بال، میرے پاؤں میں اُلجھتے تھے اور میرے چلنے میں مانع ہوتے تھے۔ آخر میں اُس تک پہنچ ہی گئی۔ میں نے اُس کے کندھے سے چادر اٹھائی اور اُس کے سر کو اُٹھا کے نہایت آہستہ سے اپنے زانو پر رکھا اور والہانہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ یہ اتصال شاید اک منٹ سے زیادہ نہ رہا ہوگا، مگر اس نے میرے جگر تک پہنچکر اک آتش سے مجھے جلا ڈالا، کہ اتنے میں سلامی کے لیے ہتھیاروں کا کھٹکا مجھے سنائی دیا اور اس کے بعد بادشاہ کمرے میں داخل ہوا۔ میرا یہ حال تھا کہ میرے ہاتھ، اپنی تمام حساسیت کے ساتھ، اک آتشِ سیال اُس کے جسم

کو پہنچا رہے تھے میں پریشان و بیتاب تھی۔ اڈریان پر میری نظر پڑی
تو میں نے دیکھا کہ غصے سے اُس کی رگیں اُبھری ہوئی ہیں، آنکھوں
میں بجلیاں کوند رہی ہیں۔ اُس ہاتھ کو جو اک حاکمانہ لباس میں ملبّس
تھا، اُس نے اُٹھایا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں جیسے
دبے پاؤں آئی تھی، ویسے ہی اُس سے نکلی اور کمرہ کے پاس پہنچنا
میرے خیال میں بھی نہ آیا۔ میں سیدھی اپنے کمرے میں گئی اور
کپڑے اُتار کر مرمر کے اوپر اوندھی گر پڑی۔ مجھے ایسا معلوم
ہوا کہ سرد سنگِ مرمر گویا اسکندریہ کی مرطوب و سرد رات
بھی میری حرارت سے گرم ہوگئی ہے۔ مجھے ہر لحہ یہ انتظار تھا کہ
بادشاہ کا کوئی سخت حکم آتا ہوگا؛ ضرور مجھے کوئی سخت سزا
دی جائیگی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ چوبدار نے دروازہ کھولا۔
اُس کے ہاتھ میں اک چاندی کی کشتی تھی جس پر اک خط رکھا ہوا
تھا اور اک سونے کا گلاس تھا جس میں اک سُرخ شربت بھرا ہوا تھا
چوبدار نے کمال احترام سے سر جھکا کر مجھ سے کہا، جہاں پناہ
نے حکم دیا ہے کہ یہ خط لیجیے اور یہ شربت۔ میں نے اس متانت

سے جو اک روما کی عورت کے آخری لمحوں کے شایانِ شان تھی'
کہا" بادشاہ سلامت کا حکم بجا لایا جائے گا" میں نے اپنے گھٹنوں پر
رکھکر اُس خط کی شاہانہ مہر کو توڑ کر کھولا، جسے دیکھتے ہی میرے
جسم کی حرارت یکایک برودت میں تبدیل ہوگئی۔ حکم تھا کہ یا تو اس
اندھے، بدشکل یونانی مسخرے کے ساتھ جو بادشاہ وقت کے دربار
میں فیلسوفی و مسخرگی کرتا تھا، شادی کروں، ورنہ بصورت انحراف
پیالہ اس کے آخری قطرے تک پیوں۔ اول میرا دل اک ضربۂ
بغاوت سے دھڑکا۔ اس کے بعد اک دم میرے ذہن میں وہ بہشت
کے چند منٹ آئے جو اُس کے سر کو اپنے بازو پر رکھکر میں نے
گزارے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ پیالہ کی طرف بڑھایا اور اس
آتشیں محبت کو یاد کرکے میں نے تہیہ کر لیا کہ موت، اور عدم اُس یاد
کو قائم و دائم رکھتی ہوئی مجھ تک پہنچے گی ......"

میں نے اپنا ہاتھ صندوق کے شیشہ کی طرف بڑھایا اور اُس کے
بازو کو شفقت سے ہاتھ لگایا، کہ اتنے میں اس شخص کی بیمار و خستہ آواز جسے
میں نے قسطنطنیۂ قدیم کا پوپ خیال کیا تھا یہ کہتی ہوئی سنائی دی: ۔

"کیا میری بھی داستانِ عشق نہ سنو گی؟" "نہیں، نہیں! اب مجھ میں اور داستانِ عشق سننے کی طاقت نہیں۔" میں گھبرا کر سیڑھی زینے کی طرف بھاگی۔ میں اپنے خواب سے بیدار ہوئی۔ اسکندریہ کی فضائے روشن میں آفتاب کھڑکیوں سے گزر کر میرے بستر تک نور برسا رہا تھا۔

کوسم سلطان

(تاریخِ عثمانی کا اک ورق)

وہ اِک شاہانہ کمرے میں رہتی تھی، جس کا سازو سامان، جس کی مفروشات جس کے پردے قیمتی بھاری، اور ریشمی تھے۔ وہ بہ نسبت صنعت کارانہ ہونے کے زیادہ محتشم تھے۔ اس نظر فریب نمائش، اس رنگین دبدبہ میں تنہا، سادہ جو ہستی نظر آتی تھی، وہ اس محلسرا کی حقیقی مالکہ، تمام ملکِ عثمانی کی حقیقی ملکہ کوسم سلطان تھی۔ وہ اک میانہ قد، نحیف و نازک عورت تھی۔ اُس کے پژمردہ، ضعیف مگر کتابی چہرے میں، اُس کے خشک رخساروں میں اُس کی آبرو کے نیچے، نہایت احتیاط سے باندھے ہوئے گہرے رنگ کے بالوں میں، جن میں کہیں کہیں سفیدی آنی شروع ہو گئی تھی، اُس کی ستوان لمبی ناک میں جس کے نتھنے اکثر متحرک رہتے تھے، اُس کے باریک ہونٹوں میں، اگر کوئی ڈھونڈھتا کہ مشرق کا وہ اسرار انگیز حسن و ادا نظر آئے، جس نے صدہا سال سے اپنے باریک پردوں سے عالمِ ادبیات میں لوگوں کے تخیل پر اک خواب

کا سا اثر ڈالتی ہے، تو وہ وہاں نظر نہ آتا۔ اُس کی آنکھیں گہری، اور اثر ڈالنے
والی تھیں، جن کو نہ اُس کے سن و سال، نہ اُس کی لمبی اور پُرخطر واقعات سے
مملو زندگی نے بگاڑا تھا۔ ان آنکھوں سے ایسی تیز اور ضیا بار شعاعیں نکلتی تھیں
جو اپنے مخاطب کے سب سے زیادہ پوشیدہ، سب سے زیادہ تاریک افکار کو روشنی
میں لے آتی تھیں۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ اُس کی پلکوں سے چھن چھن کر جو روشنی نکل
رہی ہے، اُس میں فتنہ و فساد یا مبہم ہوس و اعتراض کا عنصر زیادہ ہے۔

غرضکہ وہ اپنی معظم و شاہانہ ہیبت مجموعی، اپنے ایک گرجا کمانہ ابروؤں
اور ارادہ و حیات پرور آنکھوں کی وجہ سے اک فقیر کے جھونپڑے سے نکل کر اس
پُرشان و شوکت محلسرا میں پہنچی، اور وہاں پہنچ کر اُس نے خاتونِ مرحوم کی روح
کی گہرائیوں میں گھر کر لیا تھا، اور ایسا گھر کر لیا تھا کہ وہاں سے کسی کے نکالے
نہ نکلی۔ اُن دیوان خانوں میں جن کے کونے کونے دلبر و دلربا کوہ قاف والیوں
کے پُرعظمت ناز و ادا سے بھرے پڑے تھے، اُس نے متحیر زندگی کی چہل پہل کو
ہزار گونا زیادہ کر دیا۔ وہ ہمیشہ اوپر جانے کی کوشش کرتی تھی، اور اپنی ذکا
و فراست سے اُس نے صرف سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ محترم
ملکہ کا درجہ ہی حاصل نہیں کر لیا، بلکہ اُس کے اثر نے رفتہ رفتہ محلسرا سے نکل کے

سیاست میں، ملک کے امورِ داخلی و خارجی میں، ثروت و اقتصادیات میں، غرضکہ ہر شے میں نفوذ کرنا شروع کر دیا تھا۔

مگر ایک دن اُس نے دیکھا کہ اُس کی فرماں روائی جسے وہ اب اپنا حق سمجھنے لگی تھی، اور اُس کا اثر، سب سرنگوں تھے، اور اور عورتیں اُس کی حکمرانی میں شریک تھیں۔ آج وہ دوسرے درجے پر تھی، شاید کسی درجے پر نہ تھی۔ کیا یہی ہونا تھا؟

اور پھر اپنے ہی بیٹے کے سامنے، اور بیٹا بھی کون بیٹا، سلطان ابراہیم! محلسرا کے بھاری ریشم کے پردے ہولے ہولے خاموشی سے ہل رہے تھے۔ ان پردوں نے صدیوں سے حشمت مآب سلاطین کے وقارِ حکمرانی کو گویا وہاں مس کیا تھا۔ وہ اُن کی ہم آہنگ ہو کر خاموشی سے اِدھر اُدھر پھیر رہی تھی۔ اُس کی کامدار پاپوش سے قالین کے اوپر کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ اُس کے اعضا سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک چیتا ہے جو حملہ کرنے سے پہلے خاموشی سے آمادہ جست ہے اور رفتار حملے کو جانچتا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی سرخی زیادہ ہو گئی ہے، ہاتھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، اُس کے ہونٹوں پر اک خوفناک اور پُر درد تبسم ہے، جو اُس کے شدتِ فکر کو ظاہر کر رہے ہیں۔

آج وہ اپنے تئیں نہایت شدید بحران و ہیجان میں پاتی ہے: بیٹا اور سلطنت!
مگر اس کے دل کے باریک ترین تاروں میں، اُس کی ہستی کے پوشیدہ ترین عنصر
میں، یہ نہ خیال کیجیے گا کہ کوئی معمولی، کوئی قدرتی آرزو پوشیدہ ہے۔ اُس کا
مرحوم شوہر، اُس کا بیٹا، محل شاہی، حتّٰی کہ ایک عظیم الشان مُلک و ملت اُس کی
طاقت و قدرت کے زیادہ کرنے کے وسیلوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھے۔ قدرتی
طور پر اُسے جس چیز سے سب سے زیادہ مربوط ہونا چاہیئے تھا، وہ تُرک قوم تھی
جس سے نکل کر وہ اس درجہ پر پہنچی تھی۔ وہ اُس سے مربوط تھی، مگر یہ رابطہ
کس قدر ہلکا، کس قدر نامحسوس تھا! تخت ٹکڑے ٹکڑے ہوئے، انقلاباتِ سیاسی
کا ظہور ہوا، خون کے دریا بہے، وہ متاثر نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اُس کے بچوں
کی مصیبت بھری زندگی بھی اُسے ٹھیس لگائے بغیر گزر گئی۔ اب اُس نے معلوم
کیا کہ خاندان شاہی کے منظم سلسلے میں کوئی رسی انسان کو باندھ نہیں سکتی؛
ماں کا درجہ بھی یہاں ہیچ ہے۔ مگر اس دبدبہ و احتشام میں تنہا زندگی بسر کرنے
والی عورت نے چاہا کہ اک سلطنت کے اوپر سلطنت قائم کرے، اور اس میں وہ
کامیاب ہوئی۔

آج وزیر اعظم احمد پاشا قتل ہو چکا تھا، ینی چیریوں کی بغاوت کا ظہور ہو چکا

تھا، بازاروں میں، سڑکوں پر اختلال تھا اور ملک سانس لینے کی بھی ہمت نہیں کر سکتا تھا؛ لیکن اس بات کا منتظر تھا کہ کوئی اہم موقع پیدا ہو۔ ہر شخص اس کے لیے چشم براہ تھا۔ اس انتظار میں کوسم سلطان بھی ملک کی شریک تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ آخری نجیبہ قطعی طور پر زمام حکومت اس کے ہاتھ میں دے دیگا یہ عورت حکومت و قوت کو عزیز ترین خون سے زیادہ چاہتی تھی، اور اپنے بیٹے کو بھی اقتدار و اختیار کے مقابلہ میں قربان کرنے کے لیے حاضر تھی۔

نہیں، نہیں، یہ حکومت و جبروت جس کی وہ اس قدر عادی ہو گئی تھی، جس قدر کہ انسان سانس لینے کا، اس میں گھر کی اک لونڈی مداخلت کرے!!

یہ ہماشادہ یہ بی سنوری لونڈی، جو سلطان ابراہیم کو اپنی چھوٹی انگلیوں پر نچا رہی تھی، جو اپنی نیلی فام آنکھوں کی لمبی نگاہوں سے ملک کے سب سے زیادہ قیمتی مقامات کو دشمن کے ہاتھ میں بے پروایانہ طریقے سے سلطان سے دلوا رہی تھی، جو اپنی معمولی سے معمولی خواہش کے لیے نہایت مجنونانہ ذریعوں سے اک عظیم الشان سلطنت کو برباد کر رہی تھی۔ یہ چرکس لونڈی! اس بارد خون والی عورت، یعنی کوسم سلطان، میں اس دوسری کے مقابلہ میں اس قدر طفلانہ تہور تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے قتل کرنے کے لیے حکم دینے سے نہیں جھجکی۔ اس

لونڈی کے مقابلہ میں جس نے اک برس کے اندر اس قدر قدرت و اقتدار حاصل
کرلیا تھا، اُس کا دل نفرت و حسد سے لبریز تھا۔

یہ لونڈی، اور اس لونڈی کی خواہشیں! یہ دلبر مخلوق جو شہزادیوں سے فضیلت
لے رہی تھی مگر جو اپنی تمام دلربائی و فسوں گری کے باوجود عقل و ذکا سے
کس قدر بے بہرہ دکھاتی تھی!

جس طرح شہد کی مکھیوں کا چھتا شہد سے خالی کردیا جائے تو مکھیاں ایک تیز
بھنبھناہٹ کے ساتھ غصے سے وہاں سے روانہ ہوتی ہیں، کوسم سلطان کو دور سے
اک ایسی آواز سنائی دی تھی، جو محلِ سلطانی کے آہستہ آہستہ قریب ہوتی جاتی
تھی۔ یہ ہما شاہ جس کا لقب طرحدار لونڈی پڑ گیا تھا، اس آواز کو نہیں سُن رہی
تھی، لیکن کوسم سلطان اس آواز کو سن کر اس سے اور بھی زیادہ نفرت کر رہی تھی
یہ چرکس عنصر جو اُس کا سراسر ضد تھا، یہ ہستیاں جن کا سارا جادو اُن کے گورے
شانوں، اُن کی ہیکل تمثال گردنوں، اُن کے ریشمی بالوں میں پنہاں تھا!
کوسم سلطان ایک ایسی سریع اور تیز ذکاوت و عقل طبعی کی مالک تھی جس پر کوئی
حس یا جذبہ غلبہ نہ پا سکتا تھا، اور اس وجہ سے اپنے بیٹے، سلطان ابراہیم کو وہ
ناقابلِ عفو خیال کرتی تھی جو ہما شاہ کے نرم اور گورے بازوؤں اور شانوں

کے سامنے اِک ذلیل غلام بن کر رہ گیا تھا۔ کاش تھوڑے وقت کے لیے بھی حکومت اُس کے ہاتھ میں ہو، تو یہ جو مٹی کے اندر سے جو ابھرات سے دبی ہوئی، گردن ابھر رہی ہے اُسے کس طرح اِک چمڑے کی رسّی سے کھنچوا دیگی! دیسی مردوں کی طرح سفید شانوں پر لہراتے ہوئے بال جس نے اُسے طرحدار لونڈی کا لقب دینے ... وہ زلفِ زرتار کس طرح کیچڑ میں گھسیٹوائے گی! غضب خدا کا ملک کی یہ حقیقی ملکہ، بادشاہوں کی والدہ، ان لہراتے ہوئے زرد بالوں، ان نیلی نیلی آنکھوں کے حکم سے قریب تھا کہ جلا وطن کر دی جائے!

وہ شور آہستہ آہستہ محل شاہی کے قریب ہوتا آ رہا تھا تھوڑی دیر میں شاید دس ہزار دلوں سے جذبہ بغاوت کی دہشت ناک آواز محل سرا کے دریچوں کے نیچے سے بلند ہوئی۔ غیر منتظم قدموں کی آوازیں، ہتیاروں کی جھنکاریں تہدید آمیز شکایتیں سنائی دے رہی تھیں، گویا اک موجِ شکایت تھی جو انسانوں کے سمندر سے اٹھ رہی تھی۔ جس طرح لڑائی کا گھوڑا جسے لڑائی کی تعلیم دی گئی ہو نقارے کے بجنے کی آواز کو سن کر اپنی تمام قوت اشتیاق کے ساتھ ہنہنا کر جواب دیتا ہے، اگرتھا کا تمام جسم بھی اک پُرشوق ہیجان سے کانپ رہا تھا۔ وہ ان نشانیوں سے خوب واقف تھی۔ ترک قوم کی طغیانی و غلیانی میں وہ قوم کے ساتھ شریک

ہوگئی۔ وہ ترک قوم جو بُردبار، صبور ہونے کے باوجود، آخر تنگ آ کر کبھی کبھی اپنے حق کا مطالبہ کر ہی بیٹھتی ہے۔ کوسم سلطان باوجودیکہ اک شہری عورت تھی، لیکن وہ عقل سے زیادہ حسِ فطری سے پہچان جاتی تھی کہ کون سی بغاوت اُس کے خلاف ہے اور کون سی شورش اُس کے حق میں۔ وہ جو ہر شئے سے زیادہ اپنی عظمت کی دلدادہ تھی، اس جوششِ و غلیانِ ملی کو اپنی تیز ذکاوت سے اس طرح استعمال کرتی تھی کہ وہ ہمیشہ اُس کے عظمت و اقتدار کے بلند کرنے ہی کا اک آلہ ہو جاتے تھے۔ چاہے جوشِ قومی ہو یا محل سرا کی سازش، وہ ہمیشہ انھیں اپنے حق میں مفید طریقے سے استعمال کرتی تھی۔

شور میں زیادتی ہوئی۔ اب محل کے شہ نشینوں میں، دیوان خانوں میں، دالانوں میں، بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں، دبی دبی چیخیں نکلنے لگیں، دروازے کھلنے لگے، بند ہونے لگے، زینوں پر بھاگڑ کی آواز آنے لگی۔ ہر طرف ڈرپوک طریقے سے سرگوشیاں ہونے لگیں۔ غرضکہ فضا میں اک پریشانی انگیز انتظار محسوس ہوتا تھا، کہ آخر کار اک بڑے خوف ناک دھماکے سے محل شاہی کا بڑا پھاٹک پیچھے گرتا ہوا سنائی دیا۔ اُس کے بعد دیکھا گیا کہ سیڑھیوں سے انسانوں کا اک اژدحام جو نیچے سے پاگل ہو رہا تھا، اوپر چڑھ رہا ہے۔

کوسم اپنے کمرے سے تیزی کے ساتھ باہر نکلی۔ اُس نے اپنے خواجہ سرا،
ریحان کو اشارہ کیا اور اُسے ساتھ لے کر ایسے عظمت و وقار کے ساتھ جو بادشاہوں
کی ماؤں کے شایاں ہی تھا آگے بڑھی۔ اُس کی طبیعت میں اگر قیامت بھی برپا ہو جاتی
تو کوئی گھبراہٹ نہ پیدا ہوتی۔ اُس کے نازک کتابی چہرے اور سر کے اوپر
اک سیاہ لمبی اوڑھنی پڑی تھی۔ اپنے حیات کو اپنے چہرے میں چھپا لے،
لیکن دوسروں کی روح کی گہرائیوں تک پہنچ جانے کی کامل قدرت کے ساتھ
وہ آگے بڑھی۔ اُس کے سُبک سیر ذہن نے اک منٹ میں اپنے خطِ حرکت کو تعین
کرلیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس خوفناک سیلابِ ملت کو قوم کے سرکردہ اکابر
واعیان کو وہی روک سکتی ہے اور اُس کی ہی عقل و ذکا ایسی ہے کہ اُن کے
خطِ حرکت کو جس طرف چاہے موڑ دے۔ وہ آگے بڑھی۔ انسانی چہروں کا یہ
سیلابِ عظیم جو اک دوسرے کو ڈھکیلتا ہوا حرم کی دہلیز کی طرف آرہا تھا، اُس
کی نظرِ محتشم کے سامنے تھوڑی دیر کے لیے رُک گیا۔ ان میں سفید ریش سے قرین
چہرے، بھاری عماموں سے آراستہ سر تھے۔ یہ وہ مستحکم اور قوی آلہ ہائے
انقلاب تھے جنھوں نے ناجنہ انگیز قدرت و یک دلی سے اپنے ارادے
کو پورا کرنے کا تہیہ کر لیا تھا؛ مگر ان کی آتشیں، محترص آنکھیں متردد و مجوب ہو کر

زہر بجھے گرگئیں مصلح الدین آغا کا سفید معزز سر جھک گیا اُس کے وفادار مگر جسور چہرے پر ایک سُرخی پھیل گئی۔ مراد آغا بھی جس کی آنکھیں لمبی سیاہ ابروؤں کے نیچے خوف ناک چمک سے چمک رہی تھیں، خاموش ہوگیا۔

گوسیم سلطان نے اُن کو اتنا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے خیالات کو مجتمع کرسکیں اور ایک تیز گرجدار آواز سے کڑک کے کہا: "کیا تم بھول گئے کہ تم اس خاندانِ عالی کے پروردۂ احسان ہو؟"

اس فقرے نے وفاشعار مصلح الدین آغا کے دل پر نشتر کا کام کیا۔ اس مستقیم بڈھے نے اپنی شخصی وفاداری کو ملّت کی رفاہ و سعادت پر فدا کر دیا تھا؛ مگر وہ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو نہ روک سکا اور نمناک آنکھوں سے اُس نے گفتگو شروع کی۔ اولاً اُس نے کانپتی ہوئی بڈھی آواز سے یہ کہا کہ اُن کی موجودہ حرکات میں شخصی منفعت کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔ "میں خاندانِ شاہی کا نمک پروردہ ہوں اور میرا بال بال احسان سے جکڑا ہوا ہے۔ ایک سُرخ پھٹی عبا لے کر میں آیا تھا، اور اب اس مرتبے پر مراحمِ خسروانہ ہی کے طفیل میں پہنچا۔ کاش کہ میں یہ دن نہ دیکھتا!" یہ کہتے وقت اُس کی سفید ڈاڑھی سے رنج و ندامت کے آنسوؤں کے گرم قطرے ڈھلک رہے تھے۔ اپنے حسیات و جذبات

کو ندامت کے درجے تک لا کر وہ رکا۔ اپنے چاروں طرف کے آدمیوں میں جو سکوت طاری تھا، اُسے دیکھ کر متاثر ہوا اور اُس کے دل میں محبتِ وطن و ملّت پھر جوش زن ہوئی اور پھر اُس نے حرارت آمیز طریقے سے گفتگو شروع کی اب اُس نے ملک کے اوپر جو کچھ گزر گیا، اک اک کر کے گنانا شروع کیا :
دشمن سرحد سے گزر کر ملک میں داخل ہو چکا ہے ; آبنائے میں اعدا کے فوجی جہازوں کا بیڑا پھیلا ہوا ہے" یہ کہتے کہتے اُس کے آواز کی نرماہٹ غائب ہو گئی اور وہ اک بڈھے شیر کی طرح گرجنے لگا۔ "ملک میں بدامنی، ظلم پھیلا ہوا ہے، ناحق گلے کٹ رہے ہیں ; بے گناہ سزائیں پا رہے ہیں ; رعایا کو مال و جان کی امنیت نہیں ;" یہ کہتے کہتے اُس کی آواز میں اک غمگین مگر دین دارانہ صمیمیت قلب کی رقّت پیدا ہوئی، اور اُس نے کہا: "احکامِ شرع کی پابندی ہونی چاہیے!" والدہ سلطان اپنی متانت کو قائم رکھے ہوئے تھی۔ کبھی اُن کو اب تک کے سکوت پر سرزنش کرتی تھی اور کبھی قطعی دلائل سے اُنھیں خاموش کرنا چاہتی تھی۔

مگر اب اس اژدحام میں بے صبری کی علامتیں نمودار ہونے لگیں بھیڑ اک دوسرے کو ڈھکیلتی ہوئی آہستہ آہستہ اک اک قدم آگے ہوتی جاتی تھی،

اور اور لوگ بھی باتوں میں دخل دینے لگے تھے۔ کبھی کوئی اکھڑ جاہل ینی چری کبھی کوئی باوقار مگر پُرجوش عالم۔ شیخ الاسلام عزیز آفندی۔ باری باری سے کرسم سلطان سے مباحثہ کرتے، مگر کبھی کسی کے ذہن میں اتنی جرأت کا خیال نہ پیدا ہوتا تھا کہ بارعب و معظم والدہ سلطان کے آگے سے نکل جائے۔ جاہل و عالم، افسر و سپاہی سب اُس کے سامنے اپنے سینوں پر ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے اُس سے عرضِ حال کرتے تھے، اور اپنے حالات و خیالات کے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ جماعت جو انقلاب و اختلال کے لیے نکلی تھی، اُن کے حرکات میں اک وقار تھا جو مغربی ممالک کی انقلاب انگیز جماعتوں کی شدت و ہیجان کے مقابلے میں اُن کو ممیز کرتا تھا۔ آخر کار اک بے صبر آتشیں عمامہ پوش عالم جو ابھی اپنی جلاوطنی سے واپس آیا تھا۔ حنفی آفندی۔ اس مباحثے میں داخل ہوا، اور اُس نے اپنی پوری قدرتِ استدلال اور طلاقتِ لسانی سے اس بغاوت کے حق و عدالت پر مبنی ہونے کو ثابت کرنا شروع کیا۔ دیوان خانوں میں بھگدڑ پڑی ہوئی تھی، اور وہ اس بغاوت کے اسباب کو اک اک کر کے قطعی اور مکمل فقروں سے جتا رہا تھا۔ اُس کی آواز سے محل سرا کی غم آلودہ نیم تاریکی میں عکس صدا پیدا ہو رہا تھا۔

"دشمن نے ہر طرف ہم کو گھیر لیا ہے۔ رشوت، بے ایمانی سے نظامِ سلطنت تباہ و برباد ہو گیا، ناقوس اور گھنٹوں کی آوازوں سے موذن کی آواز دب گئی۔ عباد اللہ کے مال و جان کی امنیت ضائع ہو گئی۔ خود والدہ سلطان پر بھی ظلم کیا جا رہا ہے۔ حضور آپ اس ملت کی والدہ ہیں۔ آپ حقیقی معنوں میں اُم المومنین ہیں۔ اسی لیے ہم آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں۔"

اس کے بعد سب نے یک زبان و یک دہان ہو کر کہنا شروع کیا کہ "شہزادے کو ہمیں دیجئے اور لِلّٰہ اس قوم کے نجات حاصل کرنے میں رکاوٹ نہ پیدا کیجئے۔"

کوسم سلطان نے محسوس کیا کہ اس کا ضعیف جسم، اس کے بیٹے کا اور سلطنت کا یگانہ محافظ ہو گیا، اگر ان کی خواہش پوری کرے، تو، یا انھیں لوٹا دے، تو اس کے بیٹے کے نزدیک اس کو اپنی پرانی قوت مل جائیگی؟ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ محلسرا کے غم آگین سکون میں اک خوف آمیز آواز سنائی دی۔ ہماشاہ کی خزینہ دار بزم عالم کہہ رہی تھی: "خدا کے لیے، حضرت ملکہ ہماشاہ کو بچائیے۔" اس وقت کوسم سلطان جو اپنے بیٹے کے سقوط و تباہی کے مقابلے میں اک سدِ آہنی بنی کھڑی تھی، ہٹ گئی۔ اور اُس نے کہا:۔

"لو میں جاتی ہوں، شہزادے کو باندھ کر لاتی ہوں۔" اور اس مال کا جس نے وقتِ ضرورت دستِ ملت کو تخت اور مدد کرنے سے نہ روکا بھیجتی جیسی دعاؤں اور تحسین کے نعروں نے دیوان خانے تک تعاقب کیا۔

عورت کا انتقام

وہ کہہ رہا تھا "بھائی، تم کیا جانو یہ کس قدر المناک حقیقت ہے، جس عورت کو چاہو اس کی طرف سے تغافل دیکھو، یہی نہیں بلکہ اس کے بعد یہ بھی دیکھو کہ وہ کسی دوسرے سے مشغول ہے، دوسرے پر اس کی نگاہِ لطف و کرم ہے غرض اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عشق کی تحقیر دیکھو اور اس ذلت کے مقابلہ میں کچھ نہ کرسکو اور مقصود دل جز ہو کر اسی پر قانع نہ ہو کہ چاہے نہیں جاتے بلکہ یہ بھی محسوس کرو کہ کبھی چاہے نہ جاؤ گے، آف! میں اس مایوس عاشق کی طرح ہوں جس کے تمام رابطۂ مناسبات کو ایک ضربۂ بیوفائی نے قطع کر دیا ہو جس کی امید دل کا خون ہو گیا ہو اور جو اس کی دیوانگی سے خودکشی کا تہیہ کر چکا ہو۔ ہاں، ایک مایوس عاشق۔۔۔ یہ فقرہ جو تم نے میری زبان سے سنا ہے میں جانتا ہوں کہ ضرور تمہیں بیساختہ ہنسائے گا، مگر یہ اب ایک حقیقت ہے کہ اس کے مقابلہ میں میرے وہ پرانے نظریے ایک ایک کر کے ساقط ہو گئے اور اب چونکہ مجھ پر ہی یہ واقعات گذر رہے ہیں لہٰذا خود میں ہی اپنے سال بھر پہلے

کے مادی فلسفوں اور اپنے گذشتہ خیالات کو بے بنیاد سمجھتا ہوں، ہاں اُس وقت میں یہ نہ سوچتا تھا، اُس وقت ناتجربہ کار تھا، اب کیا کیا مجھپر نہیں گذر گیا، کیسے تلخ تجربے ہوئے، اب سب باتوں پر یقین کرتا ہوں۔

یہ ایک سادہ مگر تھوڑی سی عجیب سرگذشت ہے کہ ابتدا میں محض ایک کامیڈی تھی لیکن رفتہ رفتہ اُس نے ایک غیر قابل اجتناب ٹریجڈی کی شکل اختیار کرلی۔ میں ابتدا ہی سے بیان کروں۔

میری اور نجمہ کی مناسبت اُس وقت سے شروع ہوئی جبکہ میں استنبول پہونچا۔ اُس وقت ہم دور رشتہ داروں سے زیادہ نہ تھے جو ایک ہی گھر میں مل رہے ہوں، حتیٰ کہ ہماری ایک دوسرے سے بہت بنتی بھی نہ تھی۔ وہ ایک بدمزاج و مغرور لڑکی، میں ایک دلیر و آتشیں نوجوان، گھر میں ایک چچا کا لڑکا تھا کہ اُسے سب سے زیادہ چاہتا، سب سے زیادہ اُس کی اطاعت کرتا، ہر وقت اُس کی خدمت میں حاضر رہتا اور جب گھر میں ہوتا تو اُس کی خدمت کرنا ہی اپنے لیے سب سے بڑا پر لطف کام سمجھتا، کبھی کبھی میں بھی اُن سے جا ملتا مگر جب میں اُن آنکھوں پر نظر ڈالتا جو میری ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کی ہنسی اڑاتی معلوم ہوتی تھیں اور میرے تمام حرکات کو ایک مضحکہ آمیز نگاہ تنقید سے دیکھتی نظر

آتی تھیں تو میں پھر اُن سے علیحدہ ہو جاتا اور پھر علیحدگی میں ایک ایسا جذبہ مجھیں
میرے دل میں پیدا ہوتا تھا کہ میں ہر دفعہ اس موقع کا متلاشی رہتا تھا کہ میں بھی
ان دو شخصوں کو جو ساری دنیا کی ہنسی اُڑاتے ہیں ذلیل کردوں۔ اکثر ہمارے
درمیان کوئی نہ کوئی بات ایسی پیش آجاتی جس سے ایک جھگڑے کی بنیاد پڑجاتی
انھیں واقعات میں سے ایک واقعہ نے وہ شکل اختیار کی کہ آگے چل کر وہی ایک
سببِ انتقام ہو گیا اور تعلقات کو اُسی نے قطع کیا۔ ایک دن نہ معلوم کس مناسبت
سے۔ شاید مسئلۂ ذوق و حسنِ طبیعت پر گفتگو تھی۔ گفتگو آہستہ آہستہ شروع ہوئی مگر انھوں نے
کہنا شروع کیا کہ میں ایک گانوں کے گنوار سے زیادہ نہیں ہوں، اور پھر
اس گفتگو کا معنی دار مسکراہٹ اور اشاروں اور اس کے بعد قہقہوں سے تعاقب
کیا۔ اُس وقت میں صبر نہ کر سکا اور اس تمام استخفاف و استہزا کو ختم کرنے کے
لیے غصہ کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے گرجتا برستا چلا گیا۔ وہ متحیر نظروں
سے مجھے دیکھتے رہے، میں نے اُن کی تحقیر و تذلیل کا اس طرح اعادہ کیا:-
"میں گنوار ہوں مانا اور تم سمجھتے ہو کہ تم بہت تربیت یافتہ مجلس آرا ہو اور اس
پر تمھیں بڑا غرور ہے مگر میرے نزدیک تو تم بے تمیز محلہ کے لڑکوں سے زیادہ نہیں"
اس وقت نجمہ نے اپنی جھینپ ہنسی سے مٹانی چاہی اور میں نے بھی

خیال کیا کہ اگر سلسلۂ گفتگو زیادہ دور رہا تو وہ بھی زیادہ خلافِ تربیت باتیں ہونگی، وہاں سے چلدینا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے بعد میرے اور رنجمہ کے درمیان ایک گہری خندق کھد گئی، وہ مجھے دیکھتی تو منہ پھیر لیتی، میں اسے دیکھتا تو اس طرح ظاہر کرتا گویا اسے دیکھا ہی نہیں۔ میز پر کھانے پہ جب ہم بیٹھتے تو اس خیال سے کہ ایک دوسرے پر نظر نہ پڑ جائے نظر میز ہی پر گاڑے رہتے۔ خاندان بھر میں ہماری اور رنجمہ کی شکر رنجی نے لطیفہ کی شکل اختیار کر لی تھی، ہر شخص ہم سے اس کے متعلق ہنسی کرتا تھا، اگر ہم اتفاق کہیں ایک جگہ ہوتے تو ہمیں چھیڑا جاتا تھا۔

اسی طرح چار پانچ مہینہ کا عرصہ گذر گیا ایک دن عصر کے وقت میرا اور اُس کا زینہ پر مقابلہ ہو گیا۔ یہاں سے ایک دوسرے کو چھوئے بغیر نکلنا ممکن نہ تھا۔ میں نے خیال کیا کہ یہاں کوئی نیا جھگڑا شروع نہ ہو جائے اور اُس کی ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ اِس کے لیے کافی ہو سکتی تھی، میں نے اس وقت اُس کی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ دیکھی اور اُسے ایک مقدمۂ استہزا سمجھ کر میں اُلٹا پھرا تاکہ ہدفِ استہزا نہ ہوں۔ وہ میرے پیچھے آئی اور کہنے لگی "اب بھی روٹھے ہو بک آفندی! آؤ اب صلح کر لیں۔"

یہ اُس کی نسوانیت کی وہ احتیاجِ غرور تھی جسے وہ چھپا نہ سکی، ظاہر تھا کہ
وہ اس کا تحمل نہ کرسکی کہ میں اُس کی پروا نہ کروں۔ حالانکہ وہ مجھے چاہتی
نہ تھی لیکن وہ اس کے لیے بیتاب تھی کہ میں اُس کی طرف لوٹ آؤں۔ میں
اسے سمجھتا تھا، اور اُس کے اس قلق کا جو بلی کی خرخراہٹ کی مانند تھا، ایک
خاموش مقابلہ سے جواب دیتا تھا اور اس طرح اپنے نزدیک اُس سے انتقام
لیتا تھا۔ وہ اس سے اس درجہ متاثر ہوتی تھی کہ لوگوں نے دیکھا کہ بعض دفعہ
اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور غصہ کی وجہ سے پھوٹ پھوٹ کر
روئی۔ آخر ایک دن اُس کی اس حدت و غصہ سے اندیشہ میں پڑکر ایک بڑھیا
مجھ سے اس بگاڑ کو ختم کرنے کا وعدہ لینے کے لیے آئی اور اُس نے تمام
تفصیلات مجھے بتائیں: نجمہ مجھے چاہتی ہے، اُس کے نزدیک میرا اپنے
تئیں اس قدر لاقید و بے پروا ظاہر کرنا بڑی غداری ہے، اگر میرا طرزِ عمل یہی
رہا تو وہ ایک دن اپنے تئیں کنوئیں میں گرا دے گی۔

بڑھیا اپنے ایک خاص مبالغۂ کلام کے ساتھ مجھے سمجھاتی تھی اور خود متاثر
نظر آتی تھی لیکن میں بہت ضبط کرتا تھا کہ ہنسی میرے مُنہ سے نہ نکل جائے۔ نجمہ
مجھے چاہتی ہے! میرے لیے کنوئیں میں گر پڑے گی! آہ بیچاری نجمہ! اگر میں اُسے

نہیں چاہتا اور نہیں چاہ سکتا جس وقت میں یہ کہہ رہا تھا دروازہ آہستہ سے ہلتا معلوم ہوا، اُس وقت اپنے خیالات کو خوب صاف صاف کہکر اک خط انتقام حاصل کرنے کی غرض سے اُسے سُنانے کے لیے میں نے خوب زور زور سے کہنا شروع کیا "نجمہ بدشکل ہے، علاوہ ازیں میرے اُس کے کبھی نبھ نہیں سکتی، نیز مجھے ہرگز یقین نہیں کہ وہ مجھے چاہتی ہے باوجود اس کے میں نے اُس سے صلح کر لینے کا وعدہ کیا۔ بڑھیا نے دعائیں دیں "اللہ تمہاری جوانی قائم رکھے"

مگر ان تمام جھوٹ باتوں سے جنہیں میں نے شروع میں ذرا بھی اہمیت نہیں دی میں اتنا مغلوب ہوا کہ اب تک اس مغلوبیت کی ذلت اسارت سے نالاں ہوں۔ آج اس دن کے واقعات کو یاد کر کے میرے دل میں اک وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے گویا اک خواب وصال اک طوفانی رات میں دیکھا گیا ہو:۔

اُس دن ہم سب رات کا کھانا کھانے کے بعد گاڑیوں پر سوار ہو کر اک لمبی ہوا خوری کو نکلے، گیارہ بجے کے قریب گھر لوٹے، کپڑے اُتارنے سے پہلے میں اپنے کمرہ کی کھڑکی میں سے چاندنی کی سیر کر رہا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ کسی متردد ہاتھ نے نہایت آہستہ سے میرے دروازہ کو چھوا، اس خیال سے کہ نجمہ ہوگی، میں بالکل خاموش رہا، اگرچہ اب اُس سے بگاڑ نہیں تھا لیکن

تعلقات ایسے بھی نہیں تھے جس سے معلوم ہو کہ صبح ہوگئی۔ ایک دوسرے سے کبھی کبھی باتیں کرتے تھے لیکن ان میں حدِ تکلف برابر نمایاں رہتی تھی جس پر سے گذرنے کی قوت نہ پاتے تھے۔ اس وقت جبکہ ہر شخص اپنے کمرہ میں سونے کے لیے جا رہا ہے اُس کا اس غیر منتظر ملاقات کے لیے آنا ظاہر کرتا تھا کہ کوئی اہم مقصد ہے، اور یہ واقعہ اپنے پُراسرار ہونے پر دلالت کر رہا تھا، باوجود اس کے میں اس وقت ایک عجیب گھبراہٹ کے ساتھ اس خفیہ ملاقات سے بھاگنا چاہتا تھا ایک منٹ کے بعد اُسے شب خوابی کے ڈھیلے لباس میں دیکھ کر میں حقیقتاً متحیر رہ گیا، وہ ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے آہستہ آہستہ میری طرف آئی اُس کے ہونٹوں میں ایک معنی دار تبسم تھا، کہنے لگی "ابھی تک سوئے نہیں"؟

شروع میں میں کچھ سمجھا سا نہیں کہ اُس نے کیا کہا، میرا دل دھڑک رہا تھا اور اس کا سبب میں نہیں بتا سکتا، اُسے آدھی رات اپنے کمرہ میں تنہا دیکھ کر ایک عجیب حس میرے قلب میں پیدا ہوا میں نے اب تک نجمہ کو اس حال میں نہ دیکھا تھا، اس کا سفید باریک لباس شب خوابی جس میں اس کے بازو پورے نہیں ڈھکے گئے تھے اپنے نیچے سے اُس کے خوبصورت جسم کو اس قدر نظر فریب طریقے سے دکھا رہا تھا کہ چاند کی روشنی میں معلوم ہوتا تھا کہ یہ نازنین عورت

اک پری ہے۔ میں اک عمیق لذتِ تماشا سے اُسے دیکھ رہا تھا اور تعجب کر رہا تھا کہ کیوں اب تک میں نے اس کی طرف سے بے توجہی کی تھی۔ تو یوں کہیے نجمہ ایسی بدشکل عورت نہیں جو چاہی نہ جا سکے بلکہ حسین ہونے سے زیادہ اُس میں اک کشش تھی جو انسان کو مسخر کر لیتی ہے اور جو ایسے بہت سے حسینوں کے مقابلہ میں جو انسان کی روح کو تسلی نہ دیں اعلانِ ظفر کرتی ہے؛ اس کے چہرہ میں کوئی کمی نہ تھی، اس کی باریک سیاہ ابروئیں، گہری نیلی آنکھیں، لمبے سیاہی مائل بال اُسے حسین کہلانے کے لیے کافی تھے، صرف اس کا دہانہ ذرا بڑا تھا، اور اس تمام خوبصورتی کو ناقص کرتا تھا مگر میں اس میں بھی کوئی فقدانِ مناسبت نہیں پاتا تھا بلکہ میرا خیال تھا کہ اس چہرہ میں اک چھوٹا دہانہ آہنگ تناسب کے مغائر ہوتا۔ بہرحال ان تمام نقائص کے باوجود اس کی حالتِ روحی ایسی تھی کہ وہ مجھے حسین معلوم ہوئی، وہ میرے پاس آئی اور مٹھی میں چھپائے ہوئے ایک چیز میری طرف بڑھا کر کہنے لگی "لو تمہارے لیے مٹھائی لائی ہوں"

"شکریہ عرض کرتا ہوں"

اس کے بعد کھڑکی تک آئی اور تھوڑی دیر تک سڑک پر سے گزرنے والوں کی سیر کرتی رہی، میں خاموش تھا، پھر اپنی سلیپر کی نوک سے میرے پاؤں

کر چھوڑ کر کہنے لگی: "اب بھی مانے نہیں" اس کے بعد بہ طریق سرزنش بولی "شریر
جانتے ہو نا کہ چاہے جاتے ہو۔ اسی وجہ سے یہ ناز ہے، کیوں؟"

اس وقت میں بھی صبر نہ کر سکا:

"سنو نجمہ، میں التجا کرتا ہوں جاؤ کیا پھر مجھے دھوکہ دینا چاہتی ہو؟"
وہ بگڑ کر:

"یعنی مجھے رد کرتے ہو؟"

پھر اک تیز نظر میری آنکھوں میں ڈال کر۔

"بہت اچھا جاتی ہوں" اور یہ کہہ کے چلدی۔

میں اس مقابلہ میں مغلوب ہوا، اُس کے پیچھے دوڑا، اُس کے ہاتھ پکڑ کے
پھر کرسی تک لایا۔ اور کہا:

"دیکھو تم نے جو کیا بڑی زیادتی ہے، مجھے تسخیر کر کے چلا جانا کیا مجھے
دیوانہ بنانا چاہتی ہو؟"

وہ اپنی غالبیت سے مطمئن و خاموش تھی، میں اُس کی مظفریت کے مقابلہ
میں اک عاجز و حقیر صید کی طرح بندھا ہوا تھا۔

اس رات کے بعد ہم میں اک آتشیں دورۂ عشق شروع ہوا۔ میری،

ملاقاتیں، وعدے سوگندیں قسمیں، اس کے بعد رشک، ابتلا، وعدہ خلافیاں
ظلم وستم، روٹھنا بگڑنا، پھر رنج والم انتظار و فراق۔ اس کے بعد تغافل و
تجاہل، غرضکہ میدانِ الفت میں کبھی خوش کبھی متردد اور آخرکار نا اُمید و
خطرناک قدموں سے ہم نے قطع مسافت کی۔ اور نتیجہ وہی ہوا جو ہوتا ہے
تحسّر و ناکامی۔ اس گشت گذار میں ہم ایک ایسے مقام پر پہونچے کہ اک قدم
آگے ڈالنا ہمیں قعرِ ہلاکت میں لیجاتا۔ یہ اس قدر یقینی تھا پھر بھی پیچھے قدم
ڈالنے کی میں اپنے میں قوت نہ پاتا تھا، وہ اس تہلکہ سے جس طرح اور
مشکلات میں اور دوسرے موقعوں پر اُس نے کیا تھا اک سحر آمیز قہقہہ لگاتی
ہوئی نکل گئی، اور اس کے بعد میری ہنسی اُڑاکر مجھے چھیڑا کرتی، اُسوقت
مجھے معلوم ہوا کہ نجمہ مجھے چاہتی نہیں نہ کبھی اُس نے مجھے چاہا تھا، بے شبہ
اُس نے اپنے زخم خوردہ غرور کا انتقام مجھ سے لینا چاہا اور اس میں
وہ کامیاب ہوئی۔ اسے میں نے اُس دن معلوم کیا جس دن میں نے
اُس سے شادی کی درخواست کی، میں اُس سے اک ابدی رشتہ کی
بحث کررہا تھا، اور اُس نے اک بے انصاف قہقہے سے میری بات
کو کاٹا اور کہا "اگر اک بدشکل عورت تم جیسے حسین آدمی کے لیے دستِ

ازدواج بڑھائے تو وہ بدبخت ہو گی، اس لیے میری نصیحت ہے کہ آپ کسی ایسی عورت سے شادی کیجئے جو آپ کے قابل ہو" پھر یکایک طرزِ کلام بدل کر اور نہایت سنجیدہ اور عزم کار ہو کر کہنے لگی "ہاں، اور میری یہ عرض بھی سن لیجئے، اس کے بعد اس قسم کی باتوں کا ذکر نہ کیجئے گا، اگر آپ میرے دوست رہنا چاہتے ہیں تو جس طرح پہلے ملا کرتے تھے اسی طرح ملا کیجئے۔ ورنہ یقین کیجئے کہ بالکل آپ سے قطع تعلق کر لوں گی"

اس ضرب سے میری تمام قوت منجمد ہو کر رہ گئی۔ بالآخر میں نے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا "لیکن نجمہ تم مجھے مار ڈالو گی، سوچو تو، میں تمہارا دیوانہ ہوا جاتا ہوں"

وہ نہایت بے پروایانہ انداز سے اپنا شانہ ہلا کر بولی "لیکن میں تو تمہیں مطلق نہیں چاہتی" اتنا کہہ کر مجھے چھوڑ کے چل دی۔

اُس دن کے بعد سے میری اُس کی ملاقات نہیں ہوئی، وہ اب شفورڈ پر رہتی ہیں اور میں یہاں اک ہوٹل میں پڑا سڑ رہا ہوں۔ ایک دن میرا اُس کا پل پر مقابلہ ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے اپنا مُنہ پھیر لیا۔ سنتا ہوں اک کپتان کو نجمہ سے محبت ہو گئی ہے، اور تھوڑے دنوں میں اُن کی

ملاقاتیں، وعدے، سوگندیں، قسمیں، اس کے بعد رشک، ابتلا، وعدہ خلافیاں
ظلم و ستم، روٹھنا بگڑنا، پھر رنج والم انتظار و فراق، اس کے بعد تغافل و
تجاہل، غرضکہ میدانِ الفت میں کبھی خوش کبھی متردد اور آخرکار نا اُمید و
خطرناک قدموں سے ہم نے قطع مسافت کی۔ اور نتیجہ وہی ہوا جو ہوتا ہے
تحسّر و ناکامی۔ اس گشت گذار میں ہم ایک ایسے مقام پر پہونچے کہ اک قدم
آگے ڈالنا ہمیں قعرِ ہلاکت میں لیجاتا۔ یہ اس قدر یقینی تھا پھر بھی پیچھے قدم
ڈالنے کی میں اپنے میں قوت نہ پاتا تھا، وہ اس تہکہ سے جس طرح اور
مشکلات میں اور دوسرے موقعوں پر اُس نے کیا تھا اک سحر آمیز قہقہہ لگاتی
ہوئی نکل گئی، اور اس کے بعد میری ہنسی اُڑا کر مجھے چھیڑا کرتی، اُس وقت
مجھے معلوم ہوا کہ تجربہ مجھے چاہتی نہیں نہ کبھی اُس نے مجھے چاہا تھا، بے شبہ
اُس نے اپنے زخم خوردہ غرور کا انتقام مجھ سے لینا چاہا اور اس میں
وہ کامیاب ہوئی۔ اسے میں نے اُس دن معلوم کیا جس دن میں نے
اُس سے شادی کی درخواست کی، میں اُس سے اک ابدی رشتہ کی
بحث کر رہا تھا، اور اُس نے اک بے انصاف قہقہے سے میری بات
کو کاٹا اور کہا "اگر اک بدشکل عورت تم جیسے حسین آدمی کے لیے دست

ازدواج بڑھائے تو وہ بدبخت ہوگی، اس لیے میری نصیحت ہے کہ آپ
کسی ایسی عورت سے شادی کیجیے جو آپ کے قابل ہو" پھر یکایک طرزِ کلام
بدل کر اور نہایت سنجیدہ اور پُرعزم کا رہو کر کہنے لگی " ہاں، اور میری یہ عرض
بھی سُن لیجیے، اس کے بعد اس قسم کی باتوں کا ذکر نہ کیجیے گا، اگر آپ میرے
دوست رہنا چاہتے ہیں تو جس طرح پہلے رہا کرتے تھے اسی طرح رہا کیجیے۔
ورنہ یقین کیجیے کہ بالکل آپ سے قطع تعلق کر لوں گی"۔

اس ضرب سے میری تمام قوتِ محاکمہ منجمد ہو کر رہ گئی۔ بالآخر میں
نے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا "لیکن نجمہ تم مجھے مار ڈالو گی، سوچو تو، میں تم کو
دیوانہ وار چاہتا ہوں"۔

وہ نہایت بے پروایانہ انداز سے اپنا شانہ ہلا کر بولی "لیکن میں تو تمہیں
مطلق نہیں چاہتی" اتنا کہہ کر مجھے چھوڑ کے چل دی۔

اُس دن کے بعد سے میری اُس کی ملاقات نہیں ہوئی، وہ اب سنفورڈ
پر رہتی ہیں اور میں یہاں اک ہوٹل میں پڑا سڑ رہا ہوں۔ ایک دن میرا
اُس کا پل پر مقابلہ ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ سنتا ہوں
اک کپتان کو نجمہ سے محبت ہو گئی ہے، اور تھوڑے دنوں میں اُن کی

شادی بھی ہو جائے گی!"

میرے دوست نے اپنی داستان ختم کرکے اک عمیق آہِ سرد کھینچی اور خاموش ہو گیا، اس سکوت میں اک ایسی یاس عظیم کی جھلک نظر آتی تھی کہ مجھے خوف ہوا کہیں نظمی اس نا امیدی کی وجہ سے کوئی دیوانگی کی حرکت نہ کر بیٹھے۔

داماد کا انتخاب

شیخ امر اللہ کا سارا وقت عبادت اور اوراد و وظائف میں گزرتا تھا دوستوں عزیزوں کے بچے، بڑھ کر جوان ہو گئے۔ اُنھوں نے نہ کبھی ان کی شکل دیکھی اور نہ انھیں پہچانا۔ گھر کے انتظام سے وہ بے خبر، آنے جانے والوں سے وہ لاعلم۔ لیکن شیخ صاحب ایک ہفتہ سے بہت شش و پنج میں تھے، اُن کی پیاری بیٹی جمیلہ کے دو طالب پیدا ہوئے تھے۔ اور دونوں اتفاق سے ڈاکٹر، دونوں کے پیام لانے والے شیخ امر اللہ کے راستہ کا چھ سات دن سے تانا بانا کر رہے تھے۔ خوشامدیں کر کر کے اُن سے وعدہ لینا چاہتے تھے۔ ایک کہتا تھا، "لڑکا آپ کی جمیلہ کا دل و جان سے طالب ہے" دوسرا کہتا تھا، "لڑکے کے منہ میں ہفتہ بھر سے کھیل اُڑ کر نہیں گئی ہے، کہتا ہے اگر جمیلہ نہ ملی تو نہ کھاؤں گا، نہ پیوں گا، خودکشی کر لوں گا" شیخ امر اللہ کے لیے دونوں مجہول تھے، دونوں اگرچہ اُس کے عزیز تھے لیکن اُن کے عادات و اطوار سے واقف ہونا تو علیحدہ رہا، اُنھوں نے ابھی تک کسی کی صورت تک نہیں

دیکھی تھی۔ حیران تھے، کسے انتخاب کریں کسے اپنی بیٹی دیں فال اور استخارے
دیکھے۔ سب سے زیادہ فکر اُنہیں اُن کے اخلاق و عادات کے متعلق تھی
اُن کی بیٹی کے طالب، کیا طبیعت، کیسے خیالات رکھتے تھے؟ اگر ان کا اعتقاد
سُست اور مزاج غیر متین ہوا، تو اُن سے گذارا مشکل ہوگا۔ وہ یہ چاہتے
تھے کہ اُن کا داماد، ایک قوی ایمان کا مالک ہو۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ واقف
اصول و فروعِ دین ہو، فقرا و ضعفا کا بہت خیال کرتا ہو، نرم دل ہو، اگر
وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں کہ وہ امورِ دین سے واقف، اور ان پر
عامل ہے، تو کم سے کم دو شاہدِ عادل سے تو سُن چکے ہوں۔ اس کی تحقیق بغیر تو
وہ اپنی چہیتی بیٹی کو دینے سے رہے۔ کیا وہ اپنے لختِ جگر کو اپنے گھر سے
دھکا دیکر گلی میں پھینک دینگے؟

مگر اس کی تحقیق کس طرح کریں۔ دونوں لڑکوں میں سے کسی سے واقف نہیں
تلاش پر بھی کوئی ایسا قابلِ اعتماد آدمی نہ ملا جو اُن کے صحیح صحیح حالات بتا سکے
برخلاف اس کے اُن کے کانوں میں تو یہ خبریں پہنچی تھیں کہ اُن میں سے
ایک تو ایسا ہے جس نے عمر بھر میں ایک دفعہ بھی خدا کو سجدہ نہیں کیا، بلکہ
وہ ایک فرنگ مآب فلسفی ہے۔

آخر ایک دن شیخ امر اللہ کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ ایک مہینے سے اُن کے گھر میں، خدا کی بھیجی ہوئی ایک مہمان بڑھیا ٹھہری ہوئی تھی۔ یہ ایک بے یار و مددگار ضعیفہ تھی، جو نہ معلوم کہاں سے گھسٹتی گھسٹتی اُن کے دروازے تک آئی تھی اور اُنہوں نے اپنے ہاں اُسے ٹھہرا لیا تھا مگر بیچاری بڑھیا جس دن سے آئی اُس دن سے بیمار جو پڑی، تو آج تک بیمار تھی، بخار میں پھنک رہی تھی، اور اب اُس میں بستر سے اُٹھنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی سب گھر والے پریشان و متفکر تھے۔ ہر روز اُس کے منہ میں غذا و دوا چوا تے تھے، اور بستر پاک کرتے تھے اس بیمار کو اک طبیب حاذق کی ضرورت تھی۔ شیخ امر اللہ ایسے خسیس و سنگدل نہ تھے کہ اُس ضعیفہ کے علاج میں جس نے اُن کی چھت کے نیچے آ کر پناہ لی تھی، ہر ممکن کوشش و صرف سے دریغ کرتے لیکن یہ موقع بھی اچھا موقع تھا۔ اُن کی جوان لڑکی کے طالب دو ڈاکٹر تھے اُنہیں ہی بلانا چاہیے، اُن سے باتیں کرنی چاہئیں، اُن کے خیالات و افکار کی تحقیق کرنی چاہیے اور ان میں سے جو بہتر معلوم ہو، جمیلہ کو اُسے سونپنا چاہیے اس تجویز کا اُنہوں نے اپنی بیوی کے سوا، اور کسی سے ذکر نہیں کیا، بیوی نے جب اُن کی رائے سے اس طرح اتفاق کیا۔ گویا وہ ان میں سے کسی سے

بالکل واقف نہیں تو اُنھوں نے دونوں کو فوراً خط لکھے، جن میں دو دو دن کے فاصلے سے اُن سے ملاقات کرنے کے لیے وقت مقرر کیے۔ خط ڈاک میں ڈال دیے گئے۔

۲۰- جولائی صبح

آج صبح چٹھی رساں مجھے دو خط دے گیا۔ میں نے دونوں کو کھولا اور پڑھا۔ اللہ! میں کیسا خوش قسمت ہوں، ایک پر پیاری جمیلہ کے، اور دوسرے پر اُس کے باپ کے دستخط تھے۔

شیخ امر اللہ کے خط کا مطلب یہ ہے:-

اُن کے گھر میں کوئی بچا یک بیمار ہو گیا ہے، جب کہ میں اُن کا فرزند بننے کے لیے تیار ہوں تو اُنھیں مناسب نہیں معلوم ہوا کہ مجھے چھوڑ کے وہ کسی اور ڈاکٹر کو بُلائیں، لہٰذا مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ از راہِ سعادتمندی میں دوشنبہ ۵- جولائی کو تکلیف کر کے اُن کے گھر آؤں۔

حالانکہ جمیلہ کا پیارا خط کچھ اور ہی کہہ رہا ہے: "میرے سامنے جو تم مذہب کے متعلق واہی تباہی بکا کرتے ہو، خبردار، ابا جان کے سامنے وہ فضول بکواس مت کرنا، تم جانتے ہو ابا جان مذہب کے معاملے میں

اور اُن اعتقاد رکھنے والے ہیں جس بیماری کا انہوں نے ذکر کیا ہے وہ معمولی بیماری ہے اُس کی مصیبت تو ہم ایک مہینے سے جھیل رہے ہیں یہ تو ایک بہانہ ہے کہ تمہیں دیکھ کے، تم سے جرح کر کے تمہارے متعلق رائے قائم کیجائے کہ تمہیں دامادی میں لیں یا نہ لیں، تمہارے رقیب کا میں نے تم سے اُس دن ذکر کیا تھا۔ ابّا جان کا اُس کے نام بھی خط گیا ہے۔ وہ بھی آ رہا مگر اُس آدمی کو جس نے اپنی سی سالہ زندگی سختی میں، اور اپنی جوانی تمہاری طرح پیرس و لندن جیسے دیارِ عشرت میں نہیں بلکہ یہاں ریاضت و عبادت میں گذاری ہے، جانتے ہو، میں نے کیا خبر بھجوائی ہے؟ ابا جان کے سامنے خوب تیار ہو کے آئیں، ابا جان اگرچہ مولوی ہیں مگر مغربیت و نئی روشنی کی بڑی قدر کرتے ہیں اُن سے باتیں کریں تو ٹھونس ٹھونس کے، جا و بیجا انگریزی فقروں اور لفظوں کا استعمال کریں۔ اگر مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اُس کا صرف ایک ذریعہ ہے کہ اس ملاقات میں حتی الامکان فیشن ایبل، اور آزاد خیال بنیں"

وفا شعار، مہربان، و نوازش گار، جمیلہ کا میں کس طرح شکریہ ادا کروں اس خط کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میری اور اُس کی خوب گذرے گی۔

آج بازار جاکر اک ریشمی دوپٹے اور ریشمی پھندنے کی نہایت خوبصورت تسبیح خرید کر لاؤں گا۔

۵۔جولائی شام

میں شیخ امر اللہ سے ملاقات کرکے ابھی آیا ہوں، اپنے پیارے قابلِ عزت خسر سے مجھے شرف نیاز حاصل ہوا۔ بڑی دیر تک لطف و عنایت فرمائی، ہنس مکھ چہرے سے میرا استقبال کیا۔ مریضہ کے کمرے میں مجھے خود لے گئے۔ مریضہ کا معائنہ کرنے کے بعد ہم دونوں کمرے سے باہر آئے تو مجھ میں اور شیخ صاحب میں یہ گفتگو ہوئی،

"عزیزِ من، کہو مریضہ کی کیا کیفیت ہے"

"شکر ہے خدا کا شکر"

"بالکل ناامیدی تو نہیں، کیوں؟"

"(سر جھکا کر) اللہ بہتر جانتا ہے، انسان کچھ نہیں کہہ سکتا"

"تو کیا وہ مسافر دارِ آخرت ہے، آپکا یہ مطلب ہے؟"

"لا واللہ۔ معاذ اللہ المقلب لا یتغیر

"قطعی یاس تو نہیں؟"

"ان شاء اللہ الرحمٰن"

شیخ صاحب نے اور بہت سے سوالات مجھ سے کئے، یعنی جمیلہ نے جیسا لکھا تھا انھوں نے طرح طرح سے میری تحقیقات کی، ایک گھنٹہ سے زیادہ زیر بحث رہا۔ اس کے بعد میں نے نسخہ لکھا، اور دوا کے متعلق ہدایتیں کیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کا دن جو شیخ صاحب کی خدمت میں گذرا وہ میری زندگی کے خوش ترین، پرنشہ ترین دنوں میں سے تھا، میرے خسر بلا شک و شبہ بالکل لڈو پیڑا ہیں۔

۸۔ جولائی

میں کل پھر مریضہ کو دیکھنے گیا تھا، بیچاری بڑھیا کچھ ہوش میں تھی، باتیں بھی کرتی تھی، کچھ مسکرائی بھی، شیخ امر اللہ کی باچھیں خوشی سے کھلی جاتی تھیں مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے۔

"عزیز من! عزیز من! محض تمہاری کوشش سے اس کی حالت سنبھلی"،

میں نے بطور رد کے جواب دیا۔

آپ کیا فرما رہے ہیں، توبہ کیجئے، توبہ کیجئے، ھٰذا من فضلِ ربی لطف الٰہی لطفِ ربانی"

شیخ صاحب نے میرے معروضہ کی تصدیق فرمائی، مسکرائے اور نظر سامنے کو گاڑ دی۔ واپسی میں جمیلہ سے میری باتیں ہوئیں، صاف دل اور بھولے

رقیب کو جو دو دن قبل ذلت نصیب ہوئی جمیلہ نے اس کا حال سُنایا۔ اس کے عجیب اطوار اس کی لایعنی انگریزی سے گڈ مڈ گفتار نے شیخ صاحب کو اتنا مغلوبِ غضب کر دیا تھا کہ اُنہوں نے اُسے اپنے سامنے سے نکال دیا تھا۔

۱۲-جولائی شب

آج رات میں دیر سے گھر لوٹا، تو جمیلہ کا ایک خط مجھے ملا۔ میں نے دھڑکتے دل سے اُسے کھولا اور پڑھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ میں نے خط دوبارہ پڑھا۔ تو یہ صحیح تھا کہ جمیلہ اب میری تھی؟ شیخ امراللہ نے اس کا فیصلہ کر لیا تھا اور بیوی کو بھی اطلاع دے دی تھی۔

پیاری جمیلہ کا خط جو ایسی بڑی بشارت میرے لیے لایا، میری کامیابی کے راز کو اِس طرح بیان کر رہا ہے۔

"میں اپنے منہ پر ہاتھ رکھے کہ کہیں آواز نہ نکل جائے کواڑ کی درازمیں کان لگائے سُن رہی تھی، ابّا جان بڑی بی سے تمہارے متعلق یہ کہہ رہے تھے" حاذق ڈاکٹر ہے، اور پھر الحمدللہ، سچا مُسلمان، وہ دوسرا تو بے دین ملحد ہے۔ اور یہ اُس کی طرح دو ٹوک بات نہیں کہہ دیتا، اُمید ہے، بڑی بی، اُمید ہے جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔"

احساسات

اردو کا نیا شاعر: اقبالؔ[1]

(۱۹۰۴ء)

ہمیں خوشی اور کشادہ دلی سے ماننا چاہیے کہ اردو کو ایک نیا شاعر ملا ہے، جس کی آواز ہر روز لطیف تر، جس کا نغمہ ہر آن شیریں تر، اور جس کا تخیل ہر لحظہ بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ تنگ دلی، یہ بخل کا سا رشک، یہ اک شخص کی خداداد قابلیت کے اعتراف سے ابا کیوں ہے؟ اگر اک عندلیب خوش نوا دفعتہً اور بغتتہً، کسی شاخِ گل پر بیٹھ کر ایسی جاں آویز اور دل گداز نغمہ سنجی شروع کر دیتی ہے، جو اور عنادل میں نہیں، تو میں خیال کرتا ہوں (میں صرف خیال کرتا ہوں، کیونکہ میں عندلیب نہیں، کاش میں مرغِ خوش الحان نہیں، تو مرغِ ساکت ہی ہوتا تاکہ اپنے موجودہ ہم جنس انسانوں کی تنگ دلی کا نظارہ نہ دیکھتا!) کہ اور ہم صفیرانِ چمن اس نغمے کو سنتے ہیں اور اس نئے ہم صفیر کا دلی مسرت سے خیر مقدم کرتے ہیں، مگر ہمارے باغِ سخن کے نو آموز عنادل کسی نو عمر عندلیب کا ایسا نغمہ جو ان کے نغمے (؟) سے بدرجہا بالاتر ہو، بغیر رشک کے نہیں سن سکتے! تعجب ہے اور افسوس!

---

[1] سنہ ۱۹۲۶ء ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہ،

سفرِ بغداد

۱۹۰۴ء

(کراچی تا بصرہ)

میں یہ نہ بتاؤں گا کہ میں کب، اور کیوں، اور کہاں سے روانہ ہوا کیوں کہ میرے دوست ان تمام باتوں سے واقف ہیں، اور جو مجھے نہیں جانتے اُنھیں بتانے کی ضرورت نہیں، صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ بغداد شریف جا رہا ہوں، اور آج کل بصرہ کے اُس خوش سواد زندان میں جسے عرفِ عام میں قرنطینہ کہتے ہیں، ہندوستان سے آنے کے جرم میں دس دن کی قید بھگت رہا ہوں۔

میں نے کیا دیکھا؟ اگر آپ تاریخی مقامات اور عمارات اور کھنڈروں کی تحقیقات کے عاشق ہیں تو میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا، اگر آپ قوموں

کی طرزِ معاشرت، رسم و رواج، طریق بود و باش کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں، تو بھی میں نے بہت کم دیکھا ہے، اگر آپ کو مختلف ممالک کی طرزِ حکومت و طریقۂ سیاست میں شغف ہے، تو پھر میں عرض کروں گا کہ میں نے ابھی کچھ نہیں دیکھا، مگر ہاں اگر آپ قدرت کے مناظر سے دلچسپی رکھتے ہیں، تو میں نے بہت کچھ دیکھا ہے، میں نے دل ربا سین اور جاں فزا مناظر دیکھے ہیں لیکن بیان کرنے کی طاقت نہیں، لہٰذا خود ہی لطف اٹھاتا ہوں۔

۲۹ مارچ سنہ ۱۹۰۴ء کو اپنے پیارے دوستوں سے، کچھ ارماں بھرے اور زیادہ تر حرماں بھرے دل کے ساتھ جدا ہوا، اور دوستوں نے جس عنایت اور محبت سے مجھے خیرباد کہا ہے، اس کے شکریہ کے بجائے شکایت کو دل چاہتا ہے، کیوں کہ اس نے جدائی کے قلق کو اور صد گونہ کر دیا

کراچی پہنچتے پہنچتے مجھے احباب اور اعزا کی کشش کئی اور شہروں میں بھی لے گئی ؎

چلا میں وادیِ الفت میں راہ سوزن کی
قدم قدم پہ مجھے ڈوبنے کو چاہ ملے

آخرکار ۳ اپریل کو جہاز "کولا" پر کراچی سے روانہ ہو گیا، موسم

نہایت خوشگوار تھا۔ اور سمندر کی جبیں پر ذرا بھی بل نہ تھا، اور اگرچہ یہ میرا پہلا سمندر کا سفر تھا، لیکن میں نہیں جانتا کہ سرگرانی، اور طبیعت کا متلانا کسے کہتے ہیں۔ اور اگر سفرِ بحر ایسا ہی ہمیشہ ہوتا ہے تو میں عمر بھر سفر کرنے کو تیار ہوں لیکن لوگ کہتے ہیں۔ مئی، جون میں خلیج فارس کا مزاج برہم ہوتا ہے اور اس وقت وہ کسی کی نہیں سنتے۔

۵- اپریل کو ۲ بجے سہ پہر کے قریب مسقط پہنچے۔ اس مقام کو دیکھکر طبیعت نہایت مکدّر ہوئی۔ پہاڑ ہی پہاڑ ہیں، جن پر درخت کیسا، سوکھی گھاس کے ایک پتے تک کا نشان نہیں، اور اس پر حاکم مسقط کو دعوئے سلطانی ہے، میری رائے میں اگر وہ اپنے تئیں مالکِ وزیرِ مسقط کہیں تو نہایت مناسب ہے۔ شہر مسقط پہاڑوں سے گھرا ہے اور خود پہاڑ کی ڈھال پر واقع ہے۔ اور دُور دُور سے تو خوشنما معلوم ہوتا ہے، پکّے اور کئی منزل کے مکان ہیں، جو سمندر کے کنارے تک چلے آئے ہیں۔ کراچی میں سردی تھی، اور آگے چل کر تو مجھے پوری پوری سردی ملی، مگر یہاں خیر سے ابھی سے وسط مئی کا لطف آرہا تھا۔

میں نے چاہا کہ اُتر کے شہر دیکھ آؤں مگر قرنطینہ کے ڈاکٹر نے کسی کو اجازت نہ دی، اور ہم مسقط کو دُور ہی سے ڈنڈوت کرکے ۶ بجے شام کو روانہ

ہوگئے۔ مسقط کے بعد بوشہر تک سمندر ذرا خراب تھا، مگر میری طبیعت پھر بھی خراب نہیں ہوئی۔ ۸ اپریل کو ۸ بجے صبح بوشہر پہنچے، یہاں بھی اُترنے کی اجازت نہیں تھی، دوربین ہی سے شہر کو دیکھا، اور کچھ اچھا نہ پایا۔ (سنا ہے بوشہر کے انگور کھٹے ہوتے ہیں)

مگر میں سمجھتا ہوں کہ آدھا بوشہر تو ہمارے جہاز کے گرد ہی آ گیا تھا، ایک صاحب مجسّم قزلطینہ بنے ہوئے تھے یعنی اُن کی ٹوپی پر نہایت جلی قلم سے لکھا ہوا تھا "قزلطینہ" جس کے نیچے ایرانی نشان یعنی شیر آگے کے پنجے میں شمشیر لئے کھڑا تھا، مگر صرف ایک کمی تھی، وہ یہ کہ خود "قزلطینہ" صاحب کی صورت ڈراؤنی نہ تھی۔ پھر بھی میں اُن سے ہمیشہ دس قدم کے فاصلے پر رہا۔ چار بجے شام کو انھیں بھی خیرباد کہا۔

۹ - اپریل ۷ بجے صبح، سبحان اللہ! سبحان اللہ۔ ہم کس خطّے میں جا رہے ہیں، رات ہی بھر میں یہ کیا طلسم ہو گیا، جہاز کی دونوں جانب کیسا دل کش منظر ہے۔ دو طرفہ خرمے کے درختوں کی مسلسل قطاریں ہیں، اور اُن کے پیچھے اور نیچے گلاب اور نارنگی اور انار کے درخت ہیں، جو پھول اور پھل سے لدے ہوئے ہیں اور جہاں تک نگاہ دوربین کے ذریعے سے کام کرتی ہے،

ہمارے خوشی کے پاگل کر دینے والا منظر سامنے ہے۔ اور میں حقیقت میں تھوڑی
دیر کے لئے پاگل ہو گیا تھا۔ جہاز پر دوڑا دوڑا پھرتا ہوں، کبھی اس طرف کے
منظر کو دیکھتا ہوں اور کبھی اُس طرف کے۔

معلوم ہوا کہ ہمارا سفینہ سمندر چھوڑ کے دجلہ اور فرات کے مجموعہ پانی کے
سینہ پر چل رہا ہے اور ایک طرف ساحل ترکی ہے اور دوسری طرف ایرانی۔
دجلہ اور فرات کے نام سے میں عرض نہیں کر سکتا کہ میرے دل پر کیا اثر کیا۔ آہ!
تو اب ہم اُن دریاؤں پر ہیں، جو اسلامی تاریخ، اسلامی فسانہ، اسلامی ادب،
اسلامی شاعری کے ہر صفحے پر موجزن ہیں۔

دجلہ و فرات! دجلہ و فرات!! تو یوں کہئے کہ یہ ان منظروں میں سے
گزرتے ہیں۔ اور ان ساحلوں کو سیراب کرتے ہیں۔ میں نے سوائے کشمیر کے کہیں کسی
دریا کا کنارہ اتنی دور تک ایسا سرسبز و شاداب نہیں دیکھا، اور اصل تو یہ ہے کہ
جہلم کا کنارہ شاداب ہے اور بہت شاداب ہے، آخر ملک کشمیر ہے، لیکن دو طرفہ
میدان نظر آتا ہے، اگرچہ سرسبز میدان ہے، یہاں اس دریا کے کنارے سوائے
گھنے، اونچے، اور سرسبز درختوں اور پھولوں کے آپ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے
ہیں اوپر آسمان ہے نیچے پانی ہے، اور دائیں بائیں نظر کو یہ درخت روکے ہوئے

ہیں اور یہ سلسلہ میں سنتا ہوں کہ یہاں سے بغداد تک یعنی چار سو میل تک قائم
ہے۔ آپ کا جہاز ان سبز پوش سنتریوں کے بیچ میں فاؤ سے (جہاں سے
یہ سلسلہ شروع ہوا ہے) بغداد تک جائے گا۔ شاید لوگ خرمے کے درختوں
کی اس قدر تعریف سن کر زیر لب مسکرائیں گے: مگر یہ خیال رہے کہ یہ حجاز
یا سوڈان کے خرمے کے درخت نہیں ہیں کہ چار پانچ ایک جگہ کھڑے ہیں اور
گرد سیکڑوں میل تک ریت کا چٹیل میدان ہے۔ یہ عراقیتن کے نخلستان اور
خیاباں ہیں جن کے سایہ میں ہر قسم کے پھول اور پھل لگے ہوئے ہیں اور
دماغ کو معطر کر رہے ہیں۔

دو بجے ہم محمرہ پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا مقام ہے۔ یہاں ایرانی سرحد ختم
ہوتی ہے اور یہاں سے دو طرفہ ساحل ترکی ہے۔

یہاں بھی وہی قرنطینہ "کولا" پر برٹش سفارت کے ایک جج ہز آنر ٹیز
ورہتھ پگٹ قسطنطنیہ سے بغداد تشریف لے جا رہے تھے، جو جہاز ہندوستان سے
آتا ہے، اس کے مسافروں پر بصرہ میں ایک نہ دو دس دن کا قرنطینہ ہوتا
ہے۔ اس سے بچنے کے لئے یہ ترکیب کی گئی تھی کہ بغداد سے برٹش اسٹیم لانچ
کا میٹا محمرہ بھیجدیا گیا تھا تاکہ وہ محمرہ سے اس میں سوار ہو کے بصرہ جائیں

اور کہیں کہ میں محمرہ سے آرہا ہوں، تو اُن پر کوئی قرنطینہ نہ ہوگا لیکن دقّت یہ آن پڑی کہ محمرہ کے قرنطینہ کے افسروں نے کہا کہ اگر یہاں اُتریں گے تو پانچ دن قرنطینہ میں رہنا ہوگا؛ آخر کار یہ ہوا کہ لانچ جہاز کے ساتھ ساتھ چلا اور جب ایرانی سرحد سے نکل گئے تو ایک خالی مقام دیکھ کر جھکے سے جہاز کھڑا کیا گیا اور سر آرز کامیٹ" میں سوار ہو گئے، اور باقی ہم سب یوں ہی حسرت سے دیکھتے رہے۔

محمرہ سے بصرہ صرف کوئی تیس پینتیس میل کے فاصلے پر ہے، اور ذرا آگے بڑھتے ہی بصرہ کے مضافات شروع ہو جاتے ہیں؛ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ وہی ہیں، پھول وہی ہیں، مگر اب ان میں اُمرائے بصرہ کے مکانات شروع ہو جاتے ہیں اور ان قدرتی بے جان پھولوں میں انسانی زندہ پھول اور غنچے نظر آنے لگتے ہیں یعنی حسین اور نہایت حسین یہودی۔ آرمینین اور خال خال ترک۔ عورتیں لڑکے اور لڑکیاں دوڑ دوڑ کے لبِ دریا ہمارے جہاز کو دیکھنے آتے ہیں، اور ہم دوڑ دوڑ کے ڈک کے کنارے اُن کو دیکھنے جاتے ہیں، کاش یہ سلسلہ نامتناہی ہوتا، مگر وہ تو ایک دو گھنٹے ہی میں جہاز بصرہ پہونچ گیا، اور وہاں سے سرکاری کشتی میں بٹھا کر ہم سب قرنطینہ

پہنچائے گئے ع

زنداں کو پے چلے محمل پہ محمل کر

مگر حق یہ ہے کہ ہمارا قید خانہ بُرا نہیں، اُس کے سامنے دریا کا منظر نہایت عمدہ ہے، اور رات دن کشتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، یہاں گاڑی کا کام کشتی دیتی ہے، اس لئے کہ ہر وقت بادبانی اور غیر بادبانی دودخانی کشتیاں سامنے سے گزرتی ہیں، بعض یہودیوں کا جھرمٹ اُن کشتیوں میں عود بجاتا اور عربی گانے جنھیں ہم خاک نہیں سمجھتے گاتا سامنے سے گزرتا ہے اور عجب پُرلطف سین ہوتا ہے۔

قرنطینہ کا مکان سیکنڈ کلاس والوں کے لئے خاصے آرام کا ہے، اور میں سوائے اس کے کہ تنہا ہوں، نہایت آرام سے ہوں، موسم بے انتہا پیارا ہے کھڑکی کے سامنے گلاب کا تختہ کھلا ہے اور مہک رہا ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ ع بہشت آنجا کہ آزارے (ہائے مار ڈالا کم بخت، کس زور سے کاٹا ہے، لکھنے میں مصروف ہونے کی وجہ سے ان کی بھنبھناہٹ کی آواز بھی تو نہیں سنی، ورنہ یہ تو خبردار کر کے کاٹتے ہیں) نباشد ÷ کسے را باکسے (ارے تیری ایسی کی تیسی، پسو ہیں کہ قہر خدا کا، تمام کپڑوں کے اندر گھس گئے اور مارے

دو دو ڈوں کے تمام جسم سوج گیا) کا رے (ارے تو یہ مچھر پیٹھ میں کاٹا۔ آپ
بغیر اس کے کہ تمام کپڑے اتار ڈالوں، پسوؤں کا مارنا مشکل ہے، مچھر کو تو آسانی
سے مار بھی سکتے ہیں، کل ڈاک جائیگی، مضمون ختم کرنا ضروری ہے اور یہ کاٹ
کاٹ کر بیتاب کئے دیتے ہیں) نباشد! تو یہ مقام بہشت رہا ہے! ہائے!!
کیسا کاٹتے ہیں، میں باز آیا اس بصرہ سے، اس شدت کے مچھر اور پسو تو
میں نے کہیں نہیں دیکھے) ہے۔

اور یہ خیال رہے کہ مارچ اور اپریل کے بصرہ کا ذکر کر رہا ہوں، ورنہ
جون، جولائی میں تو بصرہ کا نام لیتے ہوئے بھی زبان پر چھالا پڑتا ہے۔ رہا
بغداد، تو وہ اس ولایت کا شملہ یا نینی تال یا کشمیر سمجھا جاتا ہے، کراچی سے
یہاں تک جس شخص سے بغداد کا ذکر آتا ہے، مارے تعریف کے اُس کی
زبان خشک ہوئی جاتی ہے۔ بغداد کا موسم یوں اچھا، میوے یوں اچھے،
پانی یوں اچھا، غرض کہ ہر چیز اچھی ہی اچھی ہے۔

اوصاف تو یوں ہے کہ جگہ تو سب یہ اچھی ہیں، مگر دس دن کا قرنطینہ،
خدا کسی کو اس مصیبت میں نہ ڈالے۔ اب مجھے بھی یہ کہنے کا موقع مل گیا
کہ میں دس دن کی قید (غنیمت تھا کہ قید بامشقت نہ تھی) بھگت چکا ہوں

قسمت میں یہ لکھا تھا۔

اب تک منظر ہی دیکھے یا کسی آدمی سے بھی ملا؟ ہاں کیوں نہیں۔ کراچی جہاز پر بیٹھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب زیادہ تر واسطہ ایرانی، عرب، یہودی، ترک اور ارمنیوں سے ہو گا۔

جہاز پر میرے ہم کلاس تین صاحب تھے (ایک ایرانی، دو ارمنی) ایرانی صاحب کو اول تو میں انگریز سمجھا، باتیں کرنے سے خیال ہوا (چونکہ انگریزی ٹھیک نہیں بول سکتے تھے) کہ فرنچ ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایرانی ہیں۔ آقا محمد نازی شیرازی نام ہے شنگھائی سے آ رہے ہیں اور وطن جا رہے ہیں۔ شنگھائی میں بہت بڑے تاجر ہیں۔ یہ سن کے مجھے بہت بڑی خوشی ہوئی۔ حقیقت میں بعد بمبئی کے مسلمانوں کے اگر تجارت میں کوئی مسلمان قوم بہت سے کام لیتی ہے تو وہ ایرانیوں کی قوم ہے۔ ترکوں کا تو اس میں نام و نشان نہیں۔ شیرازی صاحب اپنے ملک کے شیدا تھے، اور ان کے خیالات سننے کے لئے میں نے خواہ مخواہ ایران اور ایرانیوں پر اعتراضات کرنے شروع کئے، اور مجھے نہایت لطف آتا تھا جب وہ سچے جوش و خروش سے اپنے ملک کی حمایت کرتے تھے۔

دونوں ارمنی بمبئی میں تجارت کرتے ہیں اور اپنے وطن بصرہ کو آ رہے ہیں، جب وہ عربی میں باتیں کرتے تھے، تو مجھے مخالفینِ عربی بہت یاد آتے تھے، کہ کاش وہ انھیں دیکھیں اور بتائیں کہ عربی نے ان پر کیا ستم ڈھایا، اچھے خاصے انگریز بنے ہوئے تھے۔

یہاں قوموں میں بہت مغالطہ ہوتا ہے۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی عبا اور قبا بھی پہنتے ہیں اور بہت سے کوٹ پتلون پہنتے ہیں، ترکی ٹوپی سب اوڑھتے ہیں اور تو اور ناموں سے بھی تو پتا نہیں چلتا، کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔ میرے ساتھی ارمنی جو تھے، ان کے نام تھے نصر اللہ مسیح۔ اور شکر اللہ صباغ

یہاں ایک اور عجیب بات دیکھی، ہمارے ہاں تو انگریز عموماً اس بات کو پسند نہیں کرتے، کہ ہندوستانی انگریزی کپڑے پہنیں، اور خاص کر یہ کہ انگریزی ٹوپی اوڑھیں، یہاں ترک اس بات کے خواہش مند ہیں کہ سب ان کی ٹوپی اوڑھیں۔ چنانچہ یہ دونوں ارمنی انگریزی ٹوپی پہنتے تھے بصرہ پہنچتے ہی ترکی ٹوپی پہننے لگے، میں نے پوچھا تو کہا، ہم ترکی رعایا ہیں، لہذا ہمیں یہاں ترکی ٹوپی پہننی ضروری ہے۔

یہودی عموماً عبا و قبا پہنتے ہیں اور عرب تو بالکل ہی۔ ترک سب
یورپین لباس پہنتے ہیں اور اپنے تئیں یورپین سمجھتے ہیں یعنی عربوں
یہودیوں اور ارمنیوں سے بالاتر۔
مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں سرکاری نوکر ارمنی زیادہ ہیں اور ترک کم،
اب تک مجھے پانچ چھ ترک حکام سے واسطہ پڑا ہے۔ ان میں سوائے
احمد بیگ کے جو بصرہ کے سول سرجن ہیں، باقی سب (یعنی ڈاکٹر قرنطینہ و
ہیڈ کلرک وغیرہ) گریک یا ارمنی ہیں۔
احمد بیگ نوعمر آدمی ہیں۔ ڈاکٹر کیسے ہیں یہ تو میں نہیں جانتا، مگر فیشنیبل
جنٹلمین بہت زیادہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپڑے بھی پیرس سے
سلوا کر منگواتے ہیں۔
اس معاملے میں ہمارا علی گڑھ کالج دب کے نہیں رہا۔ قید تنہائی میں بیٹھا بیٹھا
دوستوں کی تصویریں اور گروپ جو ساتھ لایا ہوں، دیکھا کرتا ہوں، وہ
دو ارمنی بھی جو ساتھ ہی قید میں آئے، اور تصویریں دیکھنے لگے۔ اور پوچھنے
لگے کہ کیا یہ سب ہندوستانی ہیں، میں نے کہا ہاں، تو انھیں یقین نہ آتا
تھا، کیوں کہ وہ تو بمبئی کے بوہروں اور خوجوں کا لباس ہی ہندوستان

کے مسلمانوں کا لباس سمجھتے تھے مجھ سے کہنے لگے کہ یہ تو ترک معلوم ہوتے ہیں، اور اُن میں سے دو ایک کی تصویر کی بہت تعریف کی، ہنس کے کہا یہ کیا ہیں، ہمارے کالج میں ان سے بڑھ بڑھ کر ہیں۔

جن صاحبوں کی تعریف ہوئی ہے، میں اُن کے نام نہیں لکھنے کا، جب خدا ملائے گا، تو بتاؤں گا، فی الحال سب دوست سمجھیں کہ انھیں کی تعریف ہوئی ہے)

لوگ یقین نہ کرینگے، مگر مجھے سندباد صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا، اب تو نہایت معمر ہو گئے ہیں، اور جیسا سب جانتے ہیں، مدت مدید سے خانہ نشین ہیں، اور سیاحت ترک کر دی ہے۔

میں نے عرض کی کہ اب سیاحت کو کیوں تشریف نہیں لے جاتے، فرمایا کہ اب سیاحت کا اور جہاز رانی کا کیا لطف: دخانی جہاز میں بصرہ سے بیٹھو، جہاں چاہو چلے جاؤ۔ نہ خوف نہ خطرہ۔ نہ جہاز کی تباہی، نہ نئے نئے جزیروں کا ملنا۔

میں نے عرض کیا۔ آپ نہیں تو آپ کی قوم، جو جہاز رانی میں سب کی استاد رہی ہے وہ تو کچھ کرے۔ یا تو عرب دنیا بھر میں جہاز اور وہ بھی

بادبانی جہاز لیے پھرتے تھے۔ یا اب بصرہ سے بمبئی تک بھی نہیں لے جا سکتے
اس کو سن کر ایک آہ سرد بھری اور فرمایا "میاں تم ابھی بچے ہو، تم ان باتوں کو
کیا جانو، یہ خدائی کارخانے ہیں۔ ہر کسے پنج روز نوبت اوست۔ اب
عرب وحشی اور جاہل ہیں، اب جو لوگ اس کے اہل ہیں ان کے پاس یہ
کام گیا۔" یہ فرمایا، اور اس نورانی چہرے پر دو بڑے بڑے آنسو ڈھلکتے
نظر آئے اور پھر وہ یکایک نظروں سے غائب ہو گئے۔

اس تقریر کا مجھ پر بھی بہت اثر ہوا۔ بڑی دیر تک میں خیال میں محو رہا
اور پھر میں نے سوچا تو دیکھا کہ ان کا فرمانا صحیح تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

(۲)

بصرہ تا بغداد

رسید مژدہ کہ ایام غم نہ خواہد ماند　　چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہمارا بھی زمانہ رنج و محن یعنی قرنطینہ ختم ہو گیا،
اور ہم اپنے قفس سے با بال و پر نکل آئے۔ قسمت کا ستارہ اوج پر تھا یعنی
اسی روز "مجیدیہ" نامی جہاز بغداد کو روانہ ہونے والا تھا، بعد
"خرابی بصرہ" قرنطینہ کے مکان سے سیدھے جہاز پر پہنچے۔ اب جہاز پر

جو قدم پڑتا تھا، اُس میں ایک خاص غرور کی شان تھی کیونکہ اب ہم آزاد تھے
اور اس لفظِ آزادی کے معنی کی تہ پر ہم اب پہنچے تھے

سہ پہر کو جہاز بصرے سے روانہ ہو گیا؛ اور اُس وقت میں نے اطمینان
سے جہاز کا چکر لگانا شروع کیا، فرسٹ کلاس میں صرف ایک ترک مصطفےٰ فہمی
افندی ناظرِ دیونِ عمومیہ ولایت بغداد تھے، دوسرا مسلمان میں تھا، میں بھی
مجبوری سے اس کلاس میں تھا کیونکہ سیکنڈ کلاس میں بالکل جگہ باقی نہ تھی باقی
سب یہود و نصاریٰ تھے، سیکنڈ کلاس بالکل یہود و نصاریٰ سے بھری تھی، صرف
ایک تھرڈ کلاس تھی جس میں شوکتِ اسلام ظاہر ہو رہی تھی۔ اللہ اکبر!
مسلمانوں کی حکومت میں بھی دولت اور دولت کے ساتھ عیش و آرام دوسری ہی
قوموں کے پاس ہے۔ تھوڑی دیر بعد کپتان سے (یہ یاد رہے کہ جہاز ایک
انگریزی کمپنی کا ہے اور کپتان انگریز ہے) باتوں میں اس کا ذکر آگیا، تو
اُس نے عجیب باتیں بتائیں۔ یہ کپتان تیس برس سے اس جہاز پر ہے اس لئے
اس کا تجربہ کوئی آج کا تجربہ نہیں ہے۔ اُس نے کہا کہ تیس برس پہلے بغداد کے
مسلمان تاجر کسی طرح یہودیوں سے کم نہ تھے بلکہ بڑھے ہی تھے۔ لیکن
اس وقت یہودیوں نے یوروپین یا کہنا چاہیے امریکن ڈھنگ کی تجارت

نہ سکیں تھی۔ اس لئے مقابلہ برابر کا تھا۔ تاجر سچے سیدھے لوگ ہوتے تھے لیکن پھر یہودیوں نے امریکن ٹرسٹ کا قاعدہ اختیار کیا۔ جس میں تاجر کا مقصد شروع شروع میں نفع حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ اپنے حریف کو نقصان پہنچانا۔ اس لئے وہ حریف کو تباہ کرنے کے لئے اپنا مال ایسا کوڑیوں کے مول بیچ دیتا ہے کہ خود بھی تباہ ہو جاتا ہے اور جب مقابلہ کے لئے کوئی نہیں رہتا۔ تو میدان اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ تجارت کا مالک بلا شرکتِ غیرے ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسی طریقے سے یہودیوں نے مسلمان اور نصاریٰ کو تجارت کے میدان سے نکال دیا ہے اور اس وقت بصرہ اور بغداد کی تین چوتھائی دولت اور تجارت اُن کے ہاتھ میں ہے۔ یہودیوں کے بعد نصاریٰ کا نمبر ہے اور مسلمان تیسرے درجہ پر ہیں۔ عراق و شام کے یہودی بھی قدامت کے لحاظ سے عجیب قوم ہیں اہلِ بابل انہیں قید کر کے لائے اور حالتِ جلا وطنی میں انہوں نے دولت پیدا کرنی شروع کی۔ یونانی و رومی و عرب و عجم و مغول و ترک نے یکے بعد دیگرے حکومت کی مگر اس قدیم قوم نے ان سب کو اپنی دولت کا چوکیدار سمجھا اور سمجھتی ہے اور انہیں ان کی چوکیداری کا حق دیتی ہے اور خود دولت پیدا کرنے میں مشغول رہتی ہے۔ چوکیدار کبھی کبھی انہیں ذلیل سمجھتے ہیں مگر روپیہ

کی ضرورت ہوتی ہے تو انھیں کے آگے دست سوال دراز کرتے ہیں۔ اس وقت بغداد میں کوئی مہاجن اور بنکر غیر یہودی نہیں ہے۔

یہ تو اس دولت کا حال ہے جو چلتی پھرتی چھاؤں کی کہی جاتی ہے (گو یہ چلتی پھرتی چھاؤں اُن کے پاس سے چلتی پھرتی نظر نہیں آتی) مگر قدرت نے ایک دولت یہاں مساوی تقسیم کی ہے اور وہ دولتِ حسن ہے۔ یہود و نصاریٰ وارمنی و عرب، عراق کی سب قومیں اس سے برابر بہرہ مند ہوئی ہیں، جہاز پر سوائے میرے اور چند دیگر ہندیوں کے جو کربلائے معلّٰی کی زیارت کو جا رہے تھے کوئی سانولا نہ تھا، یہ تو مردوں کی کیفیت تھی، اور عورتوں کے حسن کا عالم تو یہاں کچھ اور ہی ہے۔ میں نے بغداد میں ابھی تک سوائے حبشیوں کے کوئی کریہ المنظر عورت نہیں دیکھی۔ حسن یہاں سب میں یکساں ہے۔ لیکن چونکہ عیسائیوں اور یہودیوں میں پردہ مطلق نہیں، اس لئے جذب نظر یہ زیادہ کرتی ہیں۔ عراق کشمیر یا یورپ کی طرح سرد ملک نہیں، قریب قریب ہندوستان کے برابر گرم ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قدرت نے یہ نعمت بھی یہاں کے لوگوں کو ایسی دریا دلی سے دے رکھی ہے؟ جہاز پر بھی مجمع حسینوں کا غیر معمولی تھا اور دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ چھوٹے پیمانہ پر محاصرۂ ٹرائے اور

محاصرۂ چتور گڑھ کے واقعات "مجیدیہ" پر بھی ہو رہے ہیں اور ہیلن اور پدمنی کی ایک جانشین دو یہودی خاندانوں کے امن و امان میں خلل انداز ہے یعنی ایک نہایت حسین لڑکی مع اپنے والدین کے بغداد جا رہی تھی۔ اس لڑکی کی شادی بغداد کے ایک نوجوان یہودی سے ٹھیری تھی، وہ بھی ساتھ تھا لیکن جہاز پر ایک دوسرا نوجوان مع اپنے والدین کے تھا۔ یہ لوگ اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ اول الذکر نوجوان سے شادی نہ ہونے دیں بلکہ اس لڑکی کو اپنے گھر کا نور بنائیں۔ روزانہ تینوں خاندانوں میں کسی نہ کسی بہانے سے لڑائی ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات کپتان کو دخل دینا پڑتا تھا ؎

شہر ہیم ست کز و فتنہ پر آشوب شود
ایں قدر نیز نباید کہ کسے خوب شود

مگر ہیلینوں اور پدمینیوں کے لئے پیرس اور علاء الدین خلجی ضرور پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کی خاطر ہزار ہا خلق خدا کا خون کر دیتے ہیں یہاں اگر تین خاندانوں میں لڑائی ہو گئی تو کونسا تعجب ہے۔

دوسرے روز شط العرب (جسے میں نے اس سے قبل دجلہ و فرات کا مجموعہ پانی، نام نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کہا تھا) ختم ہو گیا، یعنی وہ مقام

آگیا، جہاں دجلہ و فرات کا سنگم ہوتا ہے۔ اور پھر ہمارا جہاز الف لیلہ کے
جیسے اور شیخ سعدیؔ اور شعرائے عرب کے ممدوح دریائے دجلہ پر چلنا
شروع ہوا۔ اللہ رے دجلہ کی پیچیدگیاں! شاید ہی کوئی دریا اس قدر
پیچ اور چکر کھاتا جاتا ہو۔ اس وجہ سے جہاز بہت کم فاصلہ طے کر سکتا تھا۔ اگر
دریا سیدھا بہتا تو جہاز زیادہ فاصلہ طے کرتا، مگر مجھے ایسے پرلطف منظر کب
نظر آتے؟ ہاں اس وقت یاد آیا، فاؤ سے بصرے تک کے منظر کی میں نے
بے حد تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ میں سنتا ہوں کہ بصرے سے بغداد تک دریا
کے دونوں کناروں پر ایسے گھنے درخت نہ تھے جیسے فاؤ سے بصرے تک
تھے، لیکن پھر بھی بڑے اعلیٰ درجہ کے اور دلکش نخلستان نظر آتے جو
شادابی میں تو بصرے کے نخلستانوں سے شاید بڑھے ہی ہوئے
تھے اور دجلہ کے کنارے صحرا نورد بدوؤں کے خیمے بھی نظر آئے۔ ہمارے
جہاز کو دیکھ کر یہ لوگ کنارے پر ساتھ ساتھ دوڑتے اور چیختے چلاتے تھے
اور جہاز کے مسافر ان کے لئے خرمے اور نارنگیاں پھینکتے تھے جنھیں وہ
بڑے شوق سے اٹھاتے تھے اور ناچتے تھے، ان لوگوں کو دیکھ کر مجھے خیال
آتا تھا کہ یہ بھی قضا و قدر کا ایک چھوٹا سا مذاق ہے کہ جن ممالک میں ہزاروں

برس اول مدنیت نے ایسی ترقی کی ہو کہ بابل و نینوا و مدائن کا نام تاریخ میں یادگار رہے، وہاں بیسویں صدی عیسوی میں بادیہ نشین عرب اپنے خیمے لگائے پڑے ہوں اور تمدن میں صرف اتنے بڑھے ہوں کہ گلے چراتے ہوں کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی ترقی دیرپا ہے؟ اب ہم اس خطے میں جا رہے تھے جس کا چپہ چپہ قدیم تاریخ کی زینت ہے۔ وہ جہاں بکریاں چر رہی ہیں طاق کسریٰ ہے؛ وہ مٹی کا ڈھیر جو مزبلہ معلوم ہوتا ہے سلوسیا (مدائن) ہے؛ وہ کونے میں فرات کے کنارے جو مقام نظر آتا ہے وہاں یونانی جنرل فلاں و فلاں خیمہ زن ہوا تھا، اور وہاں رومن شاہنشاہ کا پرچم لہراتا تھا جب وہ یہاں سے گزرا تھا۔

چوتھے روز یار تھا، گلزار تھا، باد صبا تھی، میں نہ تھا؟ نہیں میں بھی تھا، دن کے نو بجے تھے، آفتاب میں مطلق تمازت نہ تھی، ہوا نہایت خوش گوار تھی، کہ ہم شاہد مقصود سے ہم کنار ہوئے یعنی دار السلام مدینۃ بغداد پہنچے۔

جہاز آہستہ آہستہ گمرک بغداد (کسٹم ہاؤس) تک پہنچا، اس عرصے میں میرے خیالات نے آہ! کس کس زمانے اور کس کس وقت کی سیر

کرلی اور کن کن واقعات کو مجسم کرکے اپنے سامنے بلا لیا؟ مگر گمرک پہ پہنچنا تھا کہ سب یہ خیالات عہدِ خلافتِ عباسیہ سے بڑی بیدردی سے واپس بلائے گئے۔ کشتی والوں اور حمالوں کی ایک فوج سے میں محصور کرلیا گیا۔ جنھوں نے بڑی فصاحت اور روانی کے ساتھ مجھے عربی سنانی شروع کی، اور میری طرف سے اس عربی کی داد نہ ملنے پر کسی نے کبھی سمجھایا، کسی نے بستر۔ میں کچھ فارسی کی لیاقت جتاتا ہوں اور کچھ ترکی کی ٹانگ توڑتا ہوں، مگر وہاں کون سنتا ہے، آخر یہی مناسب سمجھا کہ اگر اسباب گم کرنا منظور نہیں ہے تو ان لوگوں کے ساتھ ہو لینا چاہیے ۵

رشتہ در گردنم افگندہ "دوست"
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

اسباب ایک کشتی میں رکھ دیا گیا، اور میں بھی اس طرح گویا اسباب کا ایک جز ہوں، ایک کونے میں کو رکھ دیا گیا، اور یوں پا بہ دستِ دگرے دست بدستِ دگرے، ہم (یعنی میں اسباب) گمرک پہنچے؛ اور وہاں اپنی تھوڑی ترکی دانی نے اس قدر سمجھا دیا کہ اگر اپنا کل اسباب کھلوانا نہیں چاہتے، اور اپنی کل کتابیں ضبط کرانا نہیں چاہتے تو ایک روپیہ

افسر گمرک کے بھینٹ چڑھاؤ۔ ہم نے خوشی خوشی اُس قاضی الحاجات روپے
کو نذر کیا اور گمرک سے باہر آئے، یہاں ایک صاحب جو میرے آنے سے
واقف تھے مگر مجھ سے واقف نہ تھے ملے، میں نے اپنے تئیں اُن کے سپرد
کیا اور اب ہماری پریشانیوں اور تکالیف کا خاتمہ ہو گیا۔ بحمد اللہ

. . . .

. . . .

. . . .

آج مجھے بغداد میں دو مہینے ہو گئے ہیں، اس لئے اس کے متعلق
رائے کچھ دیکھ کے قائم ہوئی ہے: یورپ والے تو ہندوستان کے اعلیٰ سے
اعلیٰ شہروں کو بھی خراب کہتے ہیں، لیکن جہاں تک میونسپلٹی کا تعلق ہے،
بغداد ہندوستان کے شہروں سے بھی گیا گزرا ہے۔ یہ نہیں کہ یہاں
میونسپلٹی نہیں، میونسپلٹی ہے، اس کا رئیس (پریسیڈنٹ) ہے، اور منتخب شدہ
اور حکومت کے نامزد کردہ، دونوں قسم کے اعضاء (ممبر) ہیں، مگر شہر کے
(اور شہر چھوٹا نہیں، بڑا غدار شہر ہے) تمام گلی کوچے کچے ہیں، کوئی پکی سڑک
نہیں، کوچے تنگ اور پیچدار جن میں ہفتہ بھر کوڑا پڑا رہتا ہے، ہفتہ میں

ایک مرتبہ صفائی ہوتی ہے۔ صرف میدان یعنی وہ حصہ جہاں ترک رہتے ہیں اور کچہریاں ہیں صاف ہے اور وہاں سڑکیں بھی چوڑی ہیں مگر کچی لیکن ع

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

بغداد کے مکان سب پکے اور شاندار ہیں، دجلہ کے دونوں کنارے نفرہبت خوبصورت اور نئی وضع کے ہیں سڑک سے مکانوں میں داخل ہو تو تعجب ہوتا ہے کہ مکانوں میں کیسی صفائی رکھی جاتی ہے۔ یہاں عام طور پر لوگ مصارف زندگی پر زیادہ خرچ کرتے ہیں، مکانات کے تمام کمرے الافرنگ (یوروپین وضع میں) سجے ہوتے ہیں۔ سلاملق یا مسافر اودھسی (ڈرائنگ روم) کی آرائش میں بہت صرف کیا جاتا ہے اور اکثر ڈرائنگ روم کے سٹ نہایت خوبصورت اور قیمتی ہوتے ہیں۔ اہل بغداد کے شوق کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باوجود ان سڑکوں کے یہاں بہت سی فٹن اور بگھیاں ہیں اور کم و بیش سو بائسکلیں ہیں جو ان سڑکوں پر خدا ہی جانتا ہے کس طرح دوڑتی پھرتی ہیں۔

گورنمنٹ ہوس یعنی وہ عمارت جس میں تمام کچہریاں اور دفاتر ہیں اور جسے یہاں سرائے حکومت کہتے ہیں۔ بڑی شاندار عمارت

اور دفاتر ہندوستان کے دفتروں کے بلکہ ان سے بہتر سمجھے ہوتے ہیں

مدینۃ العلم والفضل بغداد، اپنی تمام فضیلت کھو بیٹھا ہے۔ مدرسۂ نظامیہ کے شہر میں آج پرانی یا نئی تعلیم کا کوئی ایسا مدرسہ نہیں ہے جسے کالج کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہاں دس بارہ اسکول ہیں، جن میں زیادہ تر یہود و نصاریٰ کے یا امریکن مشن، پروٹسٹنٹ مشن، فرنچ کیتھولک مشن کے ہیں، یہ اسکول ہندوستان کے مشنری اسکولوں کی طرح بہت منتظم اور عمدہ حالت میں ہیں، مسلمانوں کی طرف سے کوئی اسکول نہیں۔ صرف حکومت کی طرف سے چند اسکول ہیں۔ مثلاً مکتب ابتدائیہ، مکتب رشدیہ، مکتب اعدادیہ، مکتب صنائع؛ مگر اہل شہر عرب مسلمان ان میں بھی کم پڑھتے ہیں، ترک ہی زیادہ تر ان مدرسوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مکتب اعدادیہ، فوجی اسکول ہے، یہاں سے تعلیم پاکر طلبہ قسطنطنیہ کے ملٹری کالج میں بھیجے جاتے ہیں۔ اعدادیہ کے سب طالب علم فوجی وردی پہنتے ہیں اور یہ گورے گورے چھوٹے چھوٹے کپتان و کرنیل و جرنیل

اپنی چھوٹی چھوٹی وردیوں اور لال لال ٹوپیوں میں بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا خبر ہے کوئی آیندہ زمانے کا عثمان پاشا ان ہی میں پڑھ رہا ہو؟

یہاں تعلیمِ نسواں کے معنی صرف مضامین متعلق تعلیمِ نسواں لکھنا نہیں ہے عیسائیوں اور یہودیوں کے تو بہت سے مدارس نسواں ہیں۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں؛ مسلمانوں کے لئے بھی ایک مکتب نسواں ہے؛ جو ہائی اسکول کے درجہ تک ہے، اور اس میں ترکی اور بعض عربی خانمیں پڑھتی ہیں۔ خانموں کے ذکر میں پردہ کا ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا یہاں تمام مسلمان عورتیں، ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کی برقع اوڑھ کر خود بازار جاتی ہیں اور خود خرید و فروخت کرتی ہیں۔ ترکی خانموں کا پردہ بالکل برائے نام ہوتا ہے، اُن کے چہرہ کا نقاب اس قدر باریک ہوتا ہے کہ بعض اوقات قریب سے دیکھنے والوں کو چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ لباس ترکنوں کا بالکل انگریزی ہے۔ لیکن عربنوں کا عربی ہوتا ہے۔

ترکی حکومت کا سِول انتظام کیسا ہی ہو اور خدا شاہد ہے کہ اس میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے، لیکن میں افواجِ عثمانی کی بہت

تعریف سنتا تھا، وہ بہادر اور توانا ضرور ہیں، مگر اتنا کہنا پڑتا ہے احمد فیضی
پاشا مشیر (کمانڈر انچیف) ولایت بغداد[1] عساکرِ عثمانیہ کو اچھی حالت میں
نہیں رکھتے، وردیاں پھٹی ہوئی ہیں، جوتے ٹوٹے ہوئے ہیں اور وہ اس
حالت میں سڑکوں پر پڑے پھرتے ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ ممالکِ عثمانیہ کے دیگر
ولایات میں ایسی ابتر حالت میں نہیں ہیں۔ انھیں خرابیوں کے رفع کرنے
کے لئے سلطنت عثمانیہ میں نئے تعلیم یافتوں کی ایک پارٹی ہے جسے یہاں
عام طور پر اس کے فرانسیسی نام جون ترک (نوجوان ترک) کے نام سے
پکارتے ہیں اور جسے انگریزی اخبارات ینگ ٹرکش پارٹی کے لقب سے
یاد کرتے ہیں۔ یہ پارٹی ٹرکی کی نیشنل کانگرس سمجھنی چاہیئے۔ صرف فرق
اس قدر ہے کہ اس ٹرکش نیشنل کانگرس کے ممبر ٹرکی میں اپنی زبان
نہیں کھو سکتے اور انڈین نیشنل والے دھڑلے سے ہندوستان میں جلسے
کرتے ہیں اور اخبار نکالتے ہیں۔ بانی اس پارٹی کا مرحوم مدحت پاشا
تھا جسے میں اپنے اعتقاد کے موافق ٹرکی کا لبرل سید احمد خاں اور

---

[1] یہ ولایت بغداد کے مشیر ہیں اور اب کوئی سال بھر سے والی بغداد (گورنر جنرل بغداد)
بھی یہی ہیں۔ یہاں عام طور پر ان کے انتظام سے ناراضی پھیلی ہوئی ہے۔

پولیٹیکل نجات دہندہ سمجھتا ہوں۔ اس پارٹی والے بیچارے، لنڈن اور
پیرس میں جا جا کر جلسے کرتے ہیں، وہاں سے اخبار نکالتے ہیں، مگر ان کے
ہمدرد یہاں جز آنکہ بصدق دل دعائے کنند اور کچھ نہیں کر سکتے لیکن یہ
پارٹی ہمیشہ ایسی خستہ حالت میں نہیں رہی۔ جب رئیس الاحرار مدحت پاشا
کا دور دورہ تھا، تو اس پارٹی کا زور تھا، اور ۱۸۷۶ء میں ٹرکی کو
پارلیمنٹ نصیب ہو گئی تھی! کاش وہ دورہ قائم رہتا، تو آج ٹرکی کا
چھوٹا بھائی جاپان اکیلا ترقی نہ کرتا، بلکہ ترقی کی بساط پر اس کے ساتھ
یہ بھی بیٹھی ہوتی۔

اس پارٹی کے چند ممبروں سے میری بھی ملاقات ہوئی اور بہ دولت
اجنبی سمجھ کر اپنے خیالات کو انھوں نے مجھ سے نہیں چھپایا۔ ان کی لیاقت
ان کی وسعت نظر، ان کی حب وطن اور حب ملت دیکھ کر مجھے تعجب
ہوتا ہے کہ یہ لوگ ملک کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ سلطان عبدالحمید
خاں سے بالکل خوش نہیں اور انھیں ہمیشہ تخت سے اتارنے کے درپے
رہتے ہیں، ابھی حال ہی میں رپورٹر نے اطلاع دی تھی کہ خود سلطان کے
داماد، کامل پاشا مع بہت سے اعلیٰ عہدہ داروں کے شاہزادی خدیجہ

دخترِ معزول سلطان مراد خاں کے ساتھ خفیہ خط وکتابت رکھنے کے جرم میں پکڑے گئے۔ یہ بھی ینگ ٹرکش پارٹی کی ناکام کوششوں سے ایک کوشش تھی، یہاں اس کے حالات مفصل معلوم ہوئے ہیں، کوشش یہ تھی کہ سلطان عبدالحمید خاں کو معزول کرکے سلطان مراد کو دوبارہ تخت پر بٹھائیں؛ مگر پوری نہ ہوئی' نوجوان ترکوں کو چھوڑ کر عام اہل ملک بہت وفادار معلوم ہوتے ہیں۔

اللہ اللہ! بغداد کی خاک میں کیسے کیسے بزرگ سوتے ہیں' امام موسیٰ کاظم، امام محمد تقی علیہم السلام، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ؛ ان کے مزاروں کی زیارت میں نے کی؛ اور ہر جگہ نہ معلوم کن کن خیالات کا ہجوم ہوا! افسوس ہے کہ میں مذہبی آدمی نہیں اور نہ مجھے مذہبی واقفیت ہے تاہم میرے بے بہرہ دل پر اس امر کا اثر ہوتا تھا کہ میں اُن بزرگوں کی حضوری میں ہوں جو اپنے علم، اپنی فضیلت اور اپنے تقدس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے باعثِ فخر وسببِ برکت تھے،

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا مزار نہایت ہی شاندار ہے؛ مگر

شیخ، اور امام ابوحنیفہؒ کے مزاروں کی عمارتیں بہت اعلیٰ درجہ کی نہیں، تاہم کیا ان کی شان مزاروں کی رفعت سے مستغنی نہیں؟

مگر دارالخلافۃ بغداد کے شاہی محل کہاں ہیں؟ وہ کتب خانہ، وہ مدرسے، وہ رصدگاہیں کدھر ہیں؟ مدرسۂ نظامیہ کس جگہ ہے؟ قصرِ خلد کس طرف ہے؟ آہ! یہ سوالات ہلاکو خاں سے کرو۔ ہم کیا جواب دیں۔

شمس العلماء مولانا حالی دہلی کے سیاح سے کہتے ہیں ؎

لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

لیکن یہاں اس نصیحت کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ یہاں کھنڈر تک نہیں رہے۔ ولایت بغداد کے سرکاری سالنامہ میں مولف تاریخی عمارات کے ذکر میں فرماتے ہیں :-

" جہاں آج کل دفترِ نظارتِ رسومات ہے، وہاں مدرسۂ نظامیہ تھا! ہارون اور مامون کی تمام کوششوں کا یہ نتیجہ ہے!! ہاں ایک زبیدہ کا مقبرہ تو شکستہ حالت میں باقی ہے، جہاں عرب راہزن رات کو جمع ہوکر مالِ غنیمت آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ بابل جو ہزاروں برس پہلے تباہ ہو"

اُس کے کھنڈر تو باقی ہوں اور نہ باقی ہوں تو عباسیوں کے جاہ و جلال کے نشان ! مگر ہلاکو نے تھوڑا ہی تاراج کیا تھا۔

کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ جو قوم بغداد کو تباہ کرے، اُسی کی ایک شاخ جامع مسجد، قلعۂ دہلی، تاج محل آگرہ جیسی عمارتیں ہندوستان جاکر بنائے ؛ کیا یہ مغلوں کی طرف سے تباہی بغداد کا نادانستہ کفارہ تھا ؟

بہرحال اے بدبخت دہلی و آگرہ ! تم پھر بھی خوش نصیب ہو کہ تمھاری بہت سی عمارتیں قائم ہیں ؛ اور تمھارے کھنڈر ابھی غائب نہیں ہوئے، مگر اے بغداد ! — ؟

جہاں پھول کھلتے ہیں

جہاں پھول کھلتے ہیں، اور گلاب کی خوشبو شام کے سایہ میں پھیلتی ہے، ایسے وادی کے خاموش گوشہ میں، جہاں نہ دبدبہ ہو، نہ دغدغہ زندگی بسر کرنے کا لطف ہے۔

جب پھول کھلتے ہیں اور یہ کثیف اور ترش رو دنیا ہلنے لگتی ہے، ہوا میں حسِ عشق سے مشابہ آہنگِ نرم، ایک اسرار انگیز خفیف روانی پیدا ہوتی ہے، جب فرشتہ گل شبو کے مونھ کو کھولتا اور بادلوں کو رنگین کرتا ہے اُس وقت بہار کے موسم میں ایک شام کو مرجانے کا لطف ہے۔

جس وقت کہ ہلکی ہلکی ہوا چلتی ہے، اور وادی کی سطح پر، زمردیں ٹیلوں پر، اور زمردیں دامنِ کوہ پر، بادلوں کا سایہ اس طرح آتا ہے جس طرح فرشتے آسمان سے اترتے ہیں، اور میری روح کو تلاش کرتا ہے اُس وقت میری روح چاہتی ہے کہ پھولوں میں سے نکلکے بادلوں سے جا ملے اور میرا دل

یہ چاہتا ہی کہ اُسی دامانِ کوہ میں انھیں سرو کے درختوں کے سایہ میں میرے جسم کو دفن کردیں، اور اگر میں اس قابل ہوں تو میرے لئے رونے والوں کے آنسو اگر یہی میری حسنات عمر کا نتیجہ ہونگے، آس ہنستے کھیلتے دریا میں جو اس وادی میں بہتا ہی مل جائیں، نابود ہو جائیں۔

پیارے دوست! تمھیں یاد ہی کہ نہیں؟ بہار کا موسم تھا، شام کا وقت تھا، وادی (میں نام نہیں لوں گا، غیر پہچان جائیں گے) میں دریا کی موجیں ساحل کی گردن کو چومتی تھیں اور ہلکی لوریاں گاتی تھیں۔

افق میں آفتاب کی پژمردہ شعاعیں، بادلوں میں رنگ برنگ کا ہالہ بنا کے نکل رہی تھیں۔ فضائے وادی میں نہ ہوا تھی نہ حرکت تھی صرف دریا کے نیل گوں پانی پر، آفتاب کی شعاعوں کے مقابل، ایک کشتی تھی جو گویا ایک بیہوشی کے عالم میں جا رہی تھی۔ یکایک دور سے ایک قاز کی فریاد انگیز آواز آئی، دوسری نے جواب دیا، تیسری چلائی۔ اور پھر خاموشی طاری ہوگئی۔ وادی، ایک ضعیف عاشق کی طرح اپنی آغوش آسمان کی طرف پھیلائے ہوئے اُسے اپنی طرف بلا رہی تھی کہ فضائے عالم میں نہایت ہی خفیف اندھیرا چھانا شروع ہوا۔ خاموشی کچھ اور بڑھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ

عالمِ حیات کو نیند آنی شروع ہوئی اور اُس کے چہرہ پر نقاب پڑتی جاتی ہے۔
میرے پیارے! تمھیں یہ وقت اور یہ مقام یاد آیا؟ تم اُس وقت
مجھ سے کہہ رہے تھے: "وادی کا سایہ کس قدر لمبا ہوگیا ہے کیسا سکوت ہے،
سامنے کے ساحل کے درختوں کا سایہ ہم تک آرہا ہے اُس مکان سے
جو دھواں نکل رہا ہے۔ دیکھو کیسا سیدھا آسمان کی طرف جارہا ہے، آہ!
جو شخص یہاں پلے، یہاں بڑھے، یہاں زندگی بسر کرے وہ بڑا آدمی
نہیں ہو سکتا، وہ دل جو اس ہوا میں سانس لے، وہ ملوث اور داغدار
نہیں ہو سکتا۔"

بے شک اے میری جان سے زیادہ مجھے پیارے! ہر روح اُس
وادی میں صفائے روح محسوس کرتی ہے۔ مسجد سے سکون فریب آواز کے
ساتھ مؤذن کی اذان، صومعہ سے ناقوس کی پُر عظمت صدا، اور کلیسا سے
گھنٹے کی کانپتی ہوئی گونج اور شام کا وقت! کیا کیا خیالات پیدا
ہوتے ہیں اور بہار کی رات! پُر شوکت رات! انسان کو لذتِ ابد عطا
کرتی ہے۔ اس خاکدان کے ہر جگنو کے مقابلہ میں آسمان پر ایک ستارہ
نکلتا ہے آسمان اور زمین ایک خاموش نغمہ گاتے ہیں۔ آسمان روشن اور

مرصع شامیانہ کی طرح نظر آتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں سے لدی ہوئی اور ہریالی میں چھپی ہوئی دنیا، ہنس ہنس کے، چمک چمک کے اگر میری ضعیف روح کو آسمان کی خدمت میں بطور ہدیہ کے پیش کرے تو وہ قبول کرلے گا۔

پیدا ہوتے وقت رونا، بہت اچھا مانا، مگر ناامیدی کے ساتھ مرنا، اس کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی، میں ایک پر نشہ وداع کو غمگین وصال پر ترجیح دیتا ہوں، اور یہی سبب ہے آہ! یہی سبب ہے کہ چاہتا ہوں کہ دغدغہ حیات کو بہار کے پرشوق زمانہ میں، جب پھول کھل رہے ہوں اور دنیا میری طرف ہنس رہی ہو، اور میں دنیا کی طرف، ایسے وقت میں دنیا کو الوداع کہوں۔

مرے دوستانے والے

میں چاہتا ہوں کہ لوحِ عشق کی نقاشی کروں، حسن، جذباتِ محبت اور خیالاتِ سودا کی تصویریں لفظوں میں، منظوم لفظوں میں، شعر میں کھینچوں۔ میرا کلام اہلِ درد کو رلائے، اہلِ ہمت میں جوش پیدا کرے اور حسرت زدوں کی تمناؤں اور حسرتوں کی ترجمانی کرے۔ میں اک قوم کی زبان بنوں: میں شاعر ہونا چاہتا ہوں۔

میں مصور ہونا چاہتا ہوں: میں چاہتا ہوں کہ اصل میں لوحِ عشق کی نقاشی کروں، حسن، جذباتِ محبت اور خیالاتِ سودا کی تصویریں، حقیقی تصویریں کھینچوں، شاعر جو سوچتا ہے میں اس کی صورت بنا کے دکھا دوں۔ میری رنگ آمیزیاں صفحۂ قرطاس پر نیچر کا باغ کھلائیں، حسین اور دل آویز خیالات کو مجسم کر کے دکھائیں۔

میں سردارِ قوم ہونا چاہتا ہوں: گھر گھر میرا نام عزت سے لیا جائے

مجھ سے قوم کی اُمیدیں وابستہ ہوں، میں قوم کو شاہ راہِ ترقی پر لے جاؤں، میں اُن کے حقوق کی حفاظت میں رات دن کوشاں رہوں، اسی دھن میں راتوں کو نہ سوؤں، دنوں کو مصروف رہوں۔

ہاں! میری تلوار کی جھنکار سے زمانہ گونج اُٹھے۔ میرے نام کے آتے ہی شیروں کا زہرہ پانی ہو جائے۔ میری جہاں گیرانہ سطوت کی مدح میں نئے فردوسی اور ہومر پیدا ہوں، میں اور موت ہم مشرب رفیق ہوں، میں جبّار بنوں اور جباروں کو ستانے والا، تاریخ میں میرا نام خون اور شعلے سے لکھا جائے؛ میں نبردآزما بننا چاہتا ہوں۔

یہ میرا دماغ کہتا ہے۔

مگر وہ گوشت کا ٹکڑا جو تو نے میرے سینے میں پیدا کر دیا، اور جو اب بھی ہر وقت کی طرح دھڑک رہا ہے اور جب تک میں زندہ ہوں دھڑکا کرے گا اور مجھے مصیبت میں ڈالا کرے گا کہتا ہے:

"نہیں میں شہرت نہیں چاہتا، میں محبت چاہتا ہوں، سوزِ الفت چاہتا ہوں، چاہتا ہوں کسی ایک کے لئے تڑپوں، کسی ایک کے لئے دھڑکوں، کسی ایک پر فدا ہو جاؤں۔"

اک مغنیہ سے التجا

گائے جا، سُنائے جا، اللہ کے واسطے گائے جا، ٹھیر مت، رباب
کے ساتھ، ستار کے ساتھ، میرے دل کے ساتھ، گائے جا: یہ میری التجا
وہ التجا ہے جو میری روح تیری روح سے کرتی ہے: اپنے ستار کو چھیڑ،
آہ! میں التجا کرتا ہوں گائے جا!

تیری آواز۔ وہ باریک، وہ بلوریں، وہ تیرے دل کی طرح صاف اور
شفاف، وہ تیرے ننھے دل کی طرح تیری ننھی آواز، مجھے آغوش میں
لے لے، مجھے پھسلائے؛ وہ آواز جو تیرے رقیق قلب کے گوشوں سے
نکلتی ہے، اور جامۂ ناسوا کو اُتار کر عریاں اور گریاں اوپر کی طرف جاتی ہے
اور پھر اک پُرناز لرزش کے ساتھ واپس آکر تیرے ہونٹوں میں چھپ
جاتی ہے۔ وہ آواز جو خود اک شعر ہے۔ اُس منظوم آواز کے ساتھ گائے جا
میری روح کی سی نحیف، میرے دل کی سی کانپنے والی، نازک باریک آواز

سے گائے جا، ستار کے ساتھ چنگ و رباب کے ساتھ، میرے دل کے ساتھ
گائے جا۔ یہ وہ التجا ہے جو میری روح تیری روح سے کرتی ہے۔ آہ! میں
خواہش کرتا ہوں گائے جا!

گا کہ زندگی کیا ہے، سُنا کہ روح کیا ہے، محبت کیا ہے، تاکہ میں سمجھوں
اپنی اس نازنیں روح کے ساتھ گا جو پھولوں کی خوشبو کی طرح عطر پاش
ہے، اپنی دل گداز آواز کے ساتھ گا۔ جو نغمات سماوی کی طرح دل پر اثر کرتی
ہے۔ دنیا سے میرا علاقہ قطع کر دے۔ میری خواہشیں، میری حسرتیں جو نہیں
جانتیں کہ ختم ہونا کیا چیز ہے، انھیں اس طرح، بس اس طرح ختم کرنا چاہتا
ہوں کہ اس آغوش کے نرم آغوشیوں میں، اس آہنگِ دل کی رقت
میں، اس نوائے شفقت کی لطیف موج میں غرق ہو کر مر جاؤں تیری باریک
اور سُریلی آواز کی تہیں میرا کفن ہوں، اس میں لپٹ لپٹ کے مر جاؤں
اُسے چوم چوم کر جان دے دوں، اس ہوا سے زیادہ ہلکی، آسمان سے
زیادہ صاف آواز میں لپٹ کر اونچا اُڑ جاؤں اور میری آنکھیں اور
کان حشر تک اس باریک، کانپنے والی آواز کو، اس صدا کو جو اک ننھی
چڑیا کے ننھے بازوؤں کی طرح پھڑپھڑاتی ہے، بلبلوں کے منقاروں میں،

بادلوں کی رنگ آمیزیوں میں، خاموش رات کو موجوں کی فشافش میں
حزنِ قمر، خندۂ صبح میں ڈھونڈتی پھرا کریں۔

آہ! مست طیر، گائے جا، اللہ کے واسطے گائے جا، ستار کے ساتھ
میرے دل کے ساتھ، گائے جا، یہ عرض وہ ہے جو میری روح تیری روح
سے کرتی ہے۔ آہ! میں التجا کرتا ہوں، گائے جا!

میں چاہتا ہوں کہ

چاہتا... آہ چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح مجھے نہ پہچانو، نہ جانو، اپنا تغافل قائم رکھو، اور میں تلخ کام زہرناک ہجر میں زندگی بسر کروں۔ ہجر میں زخم کھا کھا کے، رو رو کے، تڑپ تڑپ کے مر جاؤں، داغوں کی سوزش سے جل جاؤں۔

اور تمھیں خبر نہ ہو کہ میں نے تمھارے لئے جان دے دی، تمھاری برق نگاہ کے خیال میں جل کر راکھ ہو گیا، تمھیں خبر نہ ہو کہ ایک پژمردہ دل تمھارا خیال کر کر کے، تمھاری یاد کر کر کے، اپنی تمام جوانی، اپنی تمام عمر کاٹ رہا ہے۔ اُس کی تمنائیں، اُمیدیں، حسرتیں تمھارے لئے ہیں، وہ تمھاری خاطر غم زدہ زندگی بسر کرنا اور تمھاری خاطر غم زدہ موت مرنا چاہتا ہے، وہ بیچارہ دل بس یہی، صرف یہی چاہتا ہے!

جب پروانہ کی طرح یا سایہ کی طرح رات دن میں تمھارے پاس تھا،

تب تو آپ [illegible] غلط انداز لطف سے شادکام نہ کیا، پس اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ کبھی شادکام نہ ہوں، آہ! اسی طرح مہجور، مقہور، اسی طرح وطن سے دور، اسی طرح مشتاق، اسی طرح حسرت کش سوزش ہائے نہانی مر جاؤں.....

میں چاہتا ہوں کہ جس طرح صبح سویرے نور کے تڑکے باغ میں چھوٹی چڑیاں ایک شاخ گل سے دوسری شاخ گل تک اڑتی پھرتی ہیں، اور گلاب کی پنکھڑیوں پر سے شبنم کے قطروں کو گرا دیتی ہیں، اور نہیں سمجھتیں کہ کیا ظلم کیا، اسی طرح تم بھی کبھی نہ سمجھو، نہ میرے جلنے کی، تمھارے لئے جینے کی، نہ میرے مرنے کی، تمھارے لئے مرنے کی، تمھاری چاہ میں مرنے کی، تمھیں خبر ہو، تم مجھے نہ دیکھو، شاید... آہ! شاید میرے مرنے کے بعد قبر پہ... مگر میں اسے بھی نہیں چاہتا، میں اس کا بھی قائل نہیں۔

میں چاہتا ہوں، چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح مجھے کبھی نہ جانو، نہ پہچانو، اپنا تغافل قائم رکھو، اور میں تلخ کام، زہرناک ہجر میں زندگی بسر کروں، ہجر میں زخم کھا کھا کے، رو رو کے، تڑپ تڑپ کے مر جاؤں، داغوں کی سوزش سے جل جاؤں۔

آہ! یہ نظریں

تھکی ہوئی تمام شب ہائے عشق کی بقیہ مسرتِ مخمور سے تھکی ہوئی نظریں!
تیری آنکھوں سے جو سرمست و شیدا و پُر لطف دقیقے دینے کے وعدے
کرتی ہیں، ان آنکھوں سے نکلنے والی ہلکی نظریں!

ان سیاہ آنکھوں کی سوزاں ظلمتوں میں ایک ایسا مبہم اشارۂ دعوت پاتا ہوں کہ میری روح ان نیوتوں کو دیکھ کے حرص سے لرزنے لگتی ہی۔

جب تک کہ تیرا لطف خریدا جاتا ہی، تو چاہے جتنی اونچی ہو، جتنی چاہے اونچی بن، عسیر الحصول نظر آ، میں بھی اک پوری رات، اک لمبی رات، تیرے یاسمینی سینے میں گزارنا چاہتا تھا، مگر میرے شوق، میری آتشِ اشتیاق کو جو تیرا کل وجود و روح چاہتی ہی، تیری بے ہیجانی، تیری بے حرارتی، تیری بے محبتی زائل کردیتی ہی، بجھا دیتی ہی۔

تیرے چاہنے والے جو تیرے دل تک ذرا نہیں پہنچ سکتے، جو

پیہ دے کر تجھ تک پہنچتے ہیں، اُن کے لئے تیرے نشے کس قدر بارد، تیرا
اظہار شوق کس قدر جھوٹا اور تیرا گلے ملنا کس قدر پُر استکراہ، تیرے
بوسے کس قدر تھکے اور سست ہیں۔

یہ جانتا ہوں، مگر پھر وہی! یہ آنکھیں، یہ سیاہ آتش سے بھڑکنے والی
سیاہ آنکھیں، اور اُن کی متلاشی ظلمتیں جو متجسس معلوم ہوتی ہیں، یہ خاموش
متانت ہیں۔ ان کی تپش میں جب میں اپنے تئیں پاتا ہوں، تو میں جی یہ
چاہنے لگتا ہوں کہ جیسے جو کچھ ہو، میں بھی ان آنکھوں کی ظلمتوں میں
ڈوب جاؤں، میں بھی اس آتش سے اپنے تئیں جلا لوں، ایک رات تو
ان آنکھوں سے سرمست آلام ہوں۔ اور اگر تو کہیں اصلی محبت کرے،
اُف! کہیں تو اک ذرا چاہے اُس وقت دیکھتی ہو۔ اس وقت کو سوچ کے
اور اپنے پر نظر ڈال کے، اپنی روح کو دیکھ کے، میں اسی طرح ڈرنے لگتا ہوں
جس طرح اک پُر طوفان رات کی پُر شور تاریکی سے کوئی ڈرے۔

نہیں، نہیں، جا، جا، میں نہیں چاہتا، اور اپنے ساتھ اپنی اُس
آواز کو بھی لے جا جو میری روح کو زیر و زبر کر رہی ہے اور اس تھکے ہوئے
نشے کو بھی ساتھ لے جا جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی محترص بغل گیری سے

حاصل ہوا ہے۔

اِتنی دور جا کہ تیری آواز کو، تیرے گانے کو نہ سن سکوں، تجھے نہ دیکھ سکوں۔ اور تو بھی اے موسیقی؟ آہ! اے موسیقی، تو بھی چپ ہو جا۔ وہ غزل نہ گا، وہ راگ نہ گا، جو مجھے زندگی کی سب سے بہتر، اُس راگ کی یاد دلاتا ہے۔ اُن حرارتوں کو، اُن شعروں کو جو میری روح میں مستور ہیں بحران و ہیجان نہ دے

کیوں کہ میں خود اپنے سے، اپنی طاقت تحمل سے شبہ کرنے لگا ہوں
کیونکہ میں ڈرنے لگا ہوں کہ میں اس عورت کے لئے سب کچھ کر گزروں گا۔
میں ڈرتا ہوں کہ میں اپنی متانت کھو بیٹھوں گا، اپنی سلامتی، اپنی انسانیت جسے میں اب تک قائم رکھ سکا ہوں، ہاتھ سے دے بیٹھوں گا۔

چپ رہ" میں کانپ رہا ہوں، دیکھ میں مرا جا رہا ہوں۔

تیتری

تمام کائنات کی آنکھوں میں اس طرح جیسے وہ ایک گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو، اسکونِ مطلق میں کچھ جنبش نہ پیدا ہوتی ہے۔ آفتاب، پریِ سحر کے رخساروں کو ایک محبت بھرا بوسہ لے کر دمکا دیتا ہے۔

وہ پُرآب نگاہ اشتیاق یعنی زہرہ، آسمان کے گلرنگ چہرے میں سے، پہاڑ کی چوٹی کے پیچھے سے، مخمور و سرمست پڑی ناچتی ہے، چمکتی دمکتی ہے۔ ساحل میں ایک گہری اور لبھانے والی خوشبو پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ درختوں کی جھالروں میں سے، مسکراتی ہوئی روشنیاں کھیلتی ہوئی نظر آتی ہیں، دل ربا آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

تمام نیچر پر پڑی ہوئی وہ رات کی رقیق، گیلی چادر رنگین ہو جاتی ہے۔ شبنم چمک اٹھتی ہے۔ ہوا کے سست سست جھونکے ادھر سے ادھر اس طرح چلتے ہیں گویا دن جاگ کر جمائیاں لے رہا ہے۔ اس

منتشر خوشی میں کبھی کبھی مرغ کی بانگیں کچھ غلغلہ ڈال دیتی ہیں، ہر چیز میں ایک لرزشِ حیات پیدا ہوتی ہے۔ کائنات خوشی کے آہنگ کے اوپر محظوظانہ رقص کرتی ہے کہ اتنے میں کرۂ آفتاب، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی چمک دار ہیبت کے ساتھ افق میں پہاڑ کی چوٹی پر سے نمودار ہوتا ہے۔

...

ایسے وقت میں، اس طرح جیسے نسیم نے ہلکا سا جھونکا لیا، نہ معلوم کہاں سے تیتری پیدا ہوتی ہے۔ آفتاب اپنے زرّیں تلاطم سے ہر چیز کو غرق کر رہا ہوتا ہے، یہ تیتری اُس نور کے دریا میں اپنے آپ گوں بازوں کے ساتھ پُر ذوق اور پُر نشہ حریر کی پشواز پہنے ناچنا شروع کرتی ہے۔

اب اُس نازک غنچے کو جو چھپ چھپ کے ہنس رہا ہے، لرزتی ہوئی جاتی ہے اور چھونا چاہتی ہے، اس کی چاروں طرف جو نور کی بارش ہو رہی ہے، اس ایک خوشی اور مستانہ وار جھوم جھوم کے پیرائی کرتی ہے، اور وہ نور بھی اُسے اپنے آغوشِ پرستش میں لیتا ہے۔

اب شاید آفتاب کی حدت سے کچھ تھک جاتی ہے یا کیا، کہ اُس کے زرّیں پروں کی حرکتوں میں کچھ سستی آتی ہے؛ اور وہ پروں کو سمیٹ کے

جھجکتی ہوئی کانپتی ہوئی، اُس پرِ نازک کی طرح، جو موج سے علیحدہ ہو گیا ہو
ہوا میں معلق لرزتی ہے۔ لیکن پھر تھوڑی دیر میں اُڑنا شروع کر دیتی ہے اور
اُس غنچے کے پاس جاتی ہے جو اپنے تنگ قبا میں سے نکلنے کی کوشش
کر رہا ہے؛ اور قبا کی تنگی کی وجہ سے ہوا میں فریاد کر رہا ہے اور بے ہوش
ہوا جاتا ہے۔ مزے لے لے کر وہ اُن اوراقِ گل کے گرد چکر لگاتی ہے جن پر
قطرۂ شبنم پڑے ہیں جو نیچر کے گویا اشکِ پرستش ہیں؛ وہ چکر لگاتی ہے اور
پھر بیٹھ جاتی ہے۔ اُف! وہ بہت بدمعاش ہے۔ اُس کی محبت ایک بوسے ہی
پر ختم ہو جاتی ہے: بوسہ لیتی ہے اور چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ وہ بہت ہرجائی
ہے، وہ بہت سیلانی ہے: وہ کسی کی ہو کے نہ رہے گی۔

اُس وقت غنچہ ایک آہِ حرمان کے ساتھ اپنا سینہ اُبھارتا ہے، اور
شاخ پر ہل ہل کر، گویا لمبی، حزیں اور عاشقانہ، نمناک نگاہِ استہزاء سے
اُسے دیکھتا ہے۔

یوں کہیے کہ تیتری محویتِ عاشقانہ کی حالت میں پری بہار کے
جسم سے نکلی ہوئی ایک خوشبو ہے جس نے شکل اختیار کر لی ہے۔ یا وہ نیچر کے؟

سب سے زیادہ روح پرور رنگوں سے مرکب اک شہپر ہے جس میں لرزشِ حیات پیدا ہوگئی ہے؛ یا اک نورِ سیال ہے جسے پریوں نے چھو کر قطرے میں تبدیل کر دیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ تیتری: کہ اک نسیم ہے کہ بہتی ہے؛ اک نفس ہے کہ آہ کر رہا ہے، ایک قطرہ ہے جس میں تلاطم پیدا ہوگیا ہے؛ اک خندہ ہے کہ ہونٹ پر جم گیا؛ اک تبسم ہے کہ رقصاں ہے اور سب سے بہتر یوں کہیے کہ تیتری اک سودا ہے بے قرار؛ اک نسیم ہے معنبر؛ ایک بوسہ ہے ذی روح اک شعر ہے، رقصاں۔

[illegible]

گھنگریالے بالوں والا، گلابی گالوں والا، شوخ چمکیلی آنکھوں والا ایک پیارا پیارا بچہ، اک طرف کو نظر گاڑے دیکھ رہا تھا کہ ہماری تیتری اسے نظر پڑی۔ اک دم اس کی نظروں میں اک شعلۂ حرص بھڑک اٹھا، منہ کھل گیا، آنکھ اس پر جم گئی، چہرہ شوق سے سرخ ہوگیا: اس نے اپنے بازو اس اڑتی تیتری کو پکڑنے کے لئے بڑھائے، اور چلا کے کہنے لگا: "اماں، اماں، تیتری" وہ شوق کی ہنسی سے ہنستا ہے اچھلتا ہے اس کے ہونٹ شدتِ اشتیاق سے کانپ رہے ہیں اور

وہ تیتری کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ آہ کیا ہی حسین منظر ہے۔ حُسن، حُسن کا
تعاقب کر رہا ہے۔ اُس کے سنبل کے سے بال جو ہوا میں لہرا رہے ہیں،
پسینے میں تر ہو جاتے ہیں۔ گال گرم ہو جاتے ہیں؛ سُرخ ہو جاتے ہیں!
سانس اکھڑ جاتا ہے۔ اب وہ تھک گیا ہے؛ گرتا پڑتا بھاگتا ہے۔ آہ ما
تیتری اُس کے ہاتھ نہیں آتی۔ ماں چلّا چلّا کے کہہ رہی ہے: "بیٹے،
دوڑ مت گر پڑے گا" تیتری، یا دوسرے الفاظ میں وہ پریشان،
بے تواں، لرزاں پر، ادھر سے اُدھر بے محابا اُڑ رہی ہے۔ اب پھر
کوئی مثال دیکھیے اور کہیے کہ تیتری ایک نور ہے؛ پاشیدہ، آخر کار
بے طاقت ہو کر؛ وہ اک پھول پر گر پڑتی ہے۔ اور اُسے اک مذبوحانہ
غیرت اور شدّت سے لپٹ کے چوسنے لگتی ہے۔ اب یوں کہیے کہ تیتری
ایک ہونٹ ہے کہ بوسہ لینے کے لئے پیدا ہوا ہے، اک نفس ہے کہ سونگھنے
کے لئے پیدا ہوا ہے۔ عشق ہے کہ لپٹنے کے لئے پیدا ہوا ہے، اس قدر
حریص ہے۔

بچّہ، خوشی کی آواز سے چلّاتا ہے: "اماں، پکڑ لی" اور خوشی
کے مارے اپنے لرزتے ہوئے، ہاتھ بڑھا کے دکھاتا ہے۔ لیکن،

الٰہی پناہ! اس رعشہ ناک ننھی سی جان کے لئے جو بچے کو نومیدانہ نگاہ سے دیکھ رہی ہے، اس کی شوخ چمکدار آنکھوں میں کچھ رحم، ذرا امان نہیں۔

اُف! چھوڑ دے، اے بچے چھوڑ دے، میں تجھ سے کہتا ہوں، وہ آج ہی کی صبح، آج ہی صبح، پرستش سحر، اور لرزش حریر سے پیدا ہوئی تھی۔ اُس نے آج صبح ہی سے زندگی شروع کی ہے۔ اُس نے ابھی ہی تو اُڑنا شروع کیا تھا۔

چھوڑ دے، ارے چھوڑ دے، میں تجھ سے کہتا ہوں، وہ بھی بالکل تیری ہی طرح ہے۔ وہ بھی تیری ہی طرح کھلنڈری ہو کر جینا چاہتی ہے۔ دیکھ ابھی اس پھول تک تو وہ پہنچی ہی نہیں۔ چھوڑ دے، چھوڑ دے اُف چھوڑ دے۔

بچہ، فاتحانہ اور مظفرانہ طریقے سے دوڑ کے آتا ہے؛ اور ہنستا اور اچھلتا اور کودتا ہوا، اپنا ہاتھ بڑھا کے، ہتھیلی کھول دیتا ہے۔ اُس کی گلرنگ ہتھیلی میں سے اک خاک گرتی ہے، ایک باریک زریں اور خوشبودار خاک۔

اب کہیے کہ
تیتری اک غبار رنگین ہے۔

کلیوپیٹرا

(دہلی کی ایک ملاقات کی یاد)

کلیوپیٹرا، مصر قدیم کی وہ پُرناز و محتشم ملکہ، جس رات بہت مغلوب ملال ہوتی، تو اپنا دل بہلانے کے لئے، اپنے مشتاق اور عاشق قیدیوں میں سے ایک کو بلا کر اپنے تمام لطفوں کے ساتھ (جو عورت ہی دے سکتی ہے، اور وہ اس طرح کہ احمق مرد پر ظاہر کرے کہ وہ اسے چاہتی ہے) اُسے مست و مدہوش کرتی، اور پھر۔ گویا وہ جانتی تھی کہ ایسی مزے دار رات کے بعد اُس قیدی کو اُس سے جدا ہو کر زندہ رہنا کیسا مشکل ہوگا۔ اپنے ہاتھ سے یہ کہکر "میری خاطر، خوشی خوشی پی گئے نا؟" زہر کا پیالہ پلا دیتی۔

آہ، میں بھی تیرا قیدی ہو جاؤں، اے دلبر! تجھے بھڑک دار فیشنوں میں، موٹر کاروں میں ناز و انداز سے بیٹھے دیکھکر تیری بیگانہ

نظروں کی ایک شعاع جو اتفاقاً مجھ پر پڑ جاتی ہے، مجھے غرقِ حرارت
کر دیتی ہے. میری روح کی بے تابانہ انجذاب میں ایک اسیرانہ
توکل ہے.

تو میرے لئے اتنی دور ہے۔ اتنی اونچی ہے، کہ کلیو پٹرا کی طرح دور
ہے، اونچی ہے. اتنی اونچی ہو کہ میری آمیدیں بھی وہاں تک نہیں پہنچ
سکتیں؛ تجھ تک ان کی رسائی نہیں.

اس چکور کی مانند جو چاند کے نور اور چمک پر عاشق ہو کر اس تک
پہنچنے کے لئے اپنے بے طاقت بازو پھڑپھڑا کے زمین پر گر پڑتی ہے
میری نظریں بھی اس اشتیاق میں اٹھتی ہیں کہ تیری ایک نظر سے
ملیں گی، گو وہ بیگانہ ہی ہو' ایک مسکراہٹ کو دیکھیں گی، گو وہ کسی
دوسرے کے لئے ہی ہونٹوں پر آئی ہو؛ تیری نظر کے ایک تارِ نور سے
گرم ہوں گی، گو وہ گریزاں ہی ہو، وہ تجھ تک جاتی ہیں اور صرف ان
بالوں میں، جو مصر کی نازو انداز بھری ملکہ کے تاج کی یاد دلاتے ہیں'
پھنس کے رہ جاتی ہیں.

وہ قیدی، اس سر کے ساتھ ایک جگہ رات گزارنے کے لئے جس

وہ تاج رکھا جاتا تھا اپنی جانیں دے دیتے تھے۔

آ، تو بھی میری کلیوپیٹرا ہے۔ جس تکیہ پر یہ بال پریشان ہوتے ہیں،
وہاں مجھے بھی سجدہ کرنے دے، اور مجھے اپنے قیدیوں میں لے لے۔

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

سید کی قبر پر

مجھے اعتراف کرنا ہے: حرص جاہ و مال و ہوس نفس سے مغلوب ہوکر وہ شعلہ جو مجھ میں کبھی - اور یہ زندگی کے علوی لمحے ہوتے ہیں - تیزی سے بھڑکتا ہے افسوس کہ اکثر - اور جس زمین سے ہم مربوط ہیں اس میں زندگی بھی بیشتر سفلی ہی ہے - بہت دھیما رہتا ہے، گو شکر ہے کہ بجھتا نہیں، اور خدا کرے کہ جس دن یہ شعلۂ قلب، میری بے حمیتی سے بجھے اس دن بلکہ اسی لحظہ یہ شمع حیات بھی گل ہو جائے۔

حرص جاہ و مال و ہوسِ نفس! بس حرص و ہوس۔ نہ یہ نصیب، نہ اس کے پورا کرنے کا اقتدار۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یہ شعلہ، یہ لاہوتی نور، مجھے چھوڑے جا رہا ہے۔ مجھے خود اس کا

حساس ہو رہا ہے - یہ ملوث محیط جس میں سب بہ رہا ہوں، زیادہ کثیف
زیادہ غلیظ ہوتا جارہا ہے۔ واعظ کا وعظ، نقیب کی ہیجان انگیز صدا،
میرے پاس سے اثر ڈالے بغیر گزر جاتے ہیں۔ واعظ کے کپڑوں کو
دیکھتا ہوں اور ہنستا ہوں، نقیب کی ہیجان انگیز صدا کو بناوٹی سمجھتا
ہوں، اسی زمانہ میں بہت سی چیزیں قلب مت کو تہیج کرتی ہیں۔ میں
یہ تو نہ کہونگا کہ ان سے متاثر نہیں ہوا۔ مگر ہاں اتنا متاثر نہیں ہوا
جتنا میں دیکھتا تھا کہ بعض اور لوگ ہوتے تھے۔

اپریل کی پانچویں تھی، میں شب کراچی ہوائے کثیف انانیت کو
پھیپھڑے میں کھینچتا ہوا ریل میں سوار ہوا اور صبح کو علی گڑھ پہنچا۔
اچھی جگہ تھی۔ مجمع احباب تھا۔ پرانی صورتیں نظر آئیں؛ سب چہرے
داڑھیاں لگائے ہوئے تھے۔ بشاش۔ فرحناک؛ خود کامگار۔
ان کا طالع ان کا یار۔ زندگی سے مستفید۔ یہ وہ لوگ تھے کہ اپنے
اور سب کی توقع سے کہیں زیادہ زندگی میں کامیاب ہوئے۔ علی گڑھ
ان کے لئے کشادہ آغوش رہتا ہے مگر وہ دوسرے؟ جنھیں دنیا نے
اپنا چہرہ متبسم نہیں دکھایا، بلکہ جنھیں نشتر حیات متواتر دنیا کے چہرہ خشمگین

ہی کی زیارت کراتا ہے۔ وہ کہاں ہیں؟ ہائے وہ علی گڑھ نہیں آتے۔
وہ ہم ظاہر پرست یارانِ قدیم میں کوئی کشش نہیں پاتے۔

کس گرم جوشی سے ہم ملے۔ چہرے بدلے ہوئے تھے بعضوں کے
چہروں پر داڑھیاں نہیں، مونچھیں سب کی آسمان کی طرف دیکھ رہی
تھیں۔ معانقہ ہوا۔ اور اس نے بتایا کہ چہرے بدلے ہوئے تو تھے
ہی، ہائے ستم! قلب بھی بدل گئے تھے۔ معانقہ پر دل کی تڑپ
ویسی بیتابانہ نہ تھی، اگرچہ معانقہ میں ایک دوسرے کو بھینچنے کی
ادا ضرورت سے زیادہ جوشش بھری تھی، دل کی دھڑکن اپنی
معمولی رفتار میں تھی۔ ہائے صداقت تو کہاں ہے؟

مد مقابل میں میرا دل تھا، کیا میں ایمانداری سے کہہ سکتا ہوں کہ
میرے دل کی پرستش میں کچھ فرق آیا تھا؟ بہت کم۔ اس طرح یہ دن
گزرا اور حسن محیط سے میں نکل کر آیا، اس میں اور اس میں سب مجھے
بہت کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔

دوسرے دن صبح کو اسٹریچی ہال میں سرسید کی برسی کا جلسہ تھا
میں پہنچا تو جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ اسپیچوں کی گرم بازاری تھی ایک

صاحب اٹھتے تھے، اسٹیج پر آکر ہاتھ ہلاتے تھے (میں بہت دور تھا) پاؤں کو بھی کبھی کبھی جنبش دیتے تھے بیٹھ جاتے تھے۔ دوسرے صاحب آ کھڑے تھے۔ مجھے یہ کچھ تیلیوں کا تماشہ معلوم ہوتا تھا جلسہ نہایت خنکی اور برودت سے ختم ہوا۔ اور معانقوں اور قہقہوں اور نعروں کی گرم بازاری پھر شروع ہوئی۔ مگر سب اب مسجد کی طرف جا رہے تھے۔

اس کی قبر کے گرد سب جمع ہوئے۔ میں پھر پہلی صف میں نہ تھا! بس دور تھا۔ فاتحہ کے لئے سب نے ہاتھ اٹھائے! اور اس کے بعد اس حریم صداقت؛ اس مدفن بے ریائی و حق گوئی سے ایک آواز آنی شروع ہوئی۔ کیسی آواز! یہ اس کی تو نہ تھی جو بے ریا خدمت خلق، نذر سچائی کو اپنے ساتھ دفن کئے ہوئے ہے۔ وہ آواز میری سنی ہوئی تھی۔ وہ اعماق کوہ سے نکلنے والی، ابر تیرہ سے کڑکنے والی رعد سے مشابہ ہوا کرتی تھی۔ ہم اکثر اس کے سامنے کانپتے ہیں۔

یہ آواز آتی تو اسی کی خواب گاہ سے تھی، مگر یہ اس کی آواز

نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہ فرشتے آسمان سے اُتر کر اُس کھلی چھت سے جو شاید اسی لئے کھلی رکھی گئی ہے داخل ہو کر اس کے بالین سے، منادیٔ غیب کی طرح حقائق آسمانی، اپنی بشارتیں اور باریک آواز سے بیان کر رہے ہیں! ایک عجیب اہتزاز سے اس منادی کی آواز مجھ تک پہنچی:۔

"جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا"

اور یہاں، اس حرم محترم کے سامنے، اس لمحے میں، میرے قلب کا شعلۂ علویت جو دبا پڑا تھا، نہایت تیزی سے بھڑک اُٹھا، میری آنکھیں پُرنم تھیں اور قلب پر رقت! الحمدللہ الحمدللہ میری معنویات تیار کی جا رہی تھیں، اور کدورت ان میں سے نکالا جا رہا تھا۔ اور اس وقت مجھے اک دوسرے منادی کا قول یاد آیا:۔

عزیزو حق کی رحمت ہے یہ پیر ناتواں ہم میں ۔۔۔ پھر ایسا پیر ہے ہم میں نہ کوئی نوجواں ہم میں
ہزاروں ہونگے ہم میں بجلہ اور نامور پیدا ۔۔۔ مگر اے قوم ایسی صورتیں پیدا کہاں ہم میں

بعد فاتحہ، یہ مجمع منتشر ہو گیا اور ہم سب واپس چلے آئے۔

مگر مجھے اک اور اعتراف کرنا ہے:۔

میں بت پرست ہوں، رکھدی کہیں جبیں میں نے

زیارت قاہرہ

(سنہ ۱۹۱۱ء)

محبت۔ وہ پری جس کے عالم شمول بازوؤں کے سائے کے نیچے
ں ابھی زندگی بسر کرتا ہوں۔ شکر ہے مجھے قاہرہ تک تو لے آئی۔
س کی تفصیل اب آپ نہ سنیے کہ آیا میں سینہ پرسکون لے کر آیا
تھا، اور متہیج لے کر نکلا یا متہیج لے کر آیا تھا اور پرسکون لے کر نکلا
زار مصر میں تنہا میں ہی اک پرشوق گرچہ بے مایہ خریدار نہیں آیا ہوں۔
ب سوت کی انٹی والی مجھ سے پہلے بھی گزر چکی ہے۔ بازار میں برقی
وشنی ہو رہی تھی، اور ازبکیہ (یہ اس حصہ شہر کا نام ہے جہاں میں
ٹھیرا تھا) ایک بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ وہ ادیب شہیر، استاد محترم، شبلی
س کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا مجھے بھی فخر حاصل ہے،
پنی علمی صحبتوں میں (جو ان کے سامنے ہی علی گڑھ سے خدا جانے
ماں سے یہ لکھنؤ چلی گئیں) اپنے شاگردوں کو اپنا اور قدیم

استادوں کا کلام سنا کر طلبہ میں مذاقِ سخن پیدا کرتے تھے۔ بازار مصر
میں آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں بار بار مصر کو بازار قاہرہ کی بجائے
صرف ایک لفظی رعایت کی وجہ سے کہتا ہوں، اہل مصر شہر قاہرہ کو
مصر کہتے ہیں) نکلتے ہی ایک مصرعہ میری زبان پر بے ساختہ آگیا:-

ڈانڈا ملا دیا ہے حبش سے تتار کا

نہیں مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ یہ مصرعہ مولانا شبلی کی زبان سے سنا
تھا۔ مصرعہ تھا یا پورا شعر، جو انھوں نے فرمایا تھا یاد نہیں۔ مگر
میں اسے بار بار دہراتا رہا۔ یہاں کی حالت پر وہ بلفظہٖ صادق
آرہا تھا۔ ہمارے شعرا کی سحر و شام کا اجتماع جیسا میں نے یہاں دیکھا
اور کہیں نظر آیا۔ جس قہوہ خانہ میں گھس جائیے، جس ٹراموے پر
سوار ہو جئے، ایک حبشی زادہ شب رنگ کے پہلو میں اک ترکِ
سمن بر بیٹھا ہوا ہے۔ شب دیجور اور صبح صادق ایک ہی میز پر
کھانا کھا رہی ہیں یا چائے پی رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ابھی تہذیب
میں مصر نے بالکل ترقی نہیں کی، ٹرانسوال سے اور ہندوستان کی
ریلوے کمپنیوں سے چند درس گویانِ مدنیت وہاں بھیجدینے چاہئیں۔

کھانے کا وقت تھا، اور میں بھوکا بھی تھا۔ ایک کھانے کے ہوٹل میں یا یہاں کی اصطلاح میں لوقنطہ میں۔ میں بھی جا بیٹھا۔ میں جب کبھی ہندوستان سے باہر آیا، ہندوستان کی ایک خصوصیت کا خیال بہت شدت کے ساتھ دماغ میں آیا۔ مصر بہت سی باتوں میں ہندوستان سے مشابہ ہے۔ موسم ملتا جلتا ہے، پیداوار قریب قریب یکساں ہے۔

باشندوں میں اختلاف مذہب بھی ہندوستان کی طرح شدید ہے نئی اور پرانی تہذیبیں دونوں یہاں بھی ہندوستان کی طرح جلوہ گر ہیں۔ ہندوستان کے مانند یہاں بھی طرز قدیم اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے مدافعانہ گو مذبوحانہ کوشش میں مصروف ہے، اور طرز جدید حملہ کناں ہے۔ سیاسیات میں ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کے مخاصمانہ تعلقات کا تجربہ مصر میں قبطی اور مسلمانوں کے تعلقات نے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی اتارا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر طرز معاشرت میں وہ یکسانیت ہے جسے آنکھیں ہندوستان میں حسرت سے ڈھونڈھتی ہیں اور نہیں پاتیں، یکسانیت ہی نہیں

شتراک بھی ہو۔ اخبارات کو دیکھیے تو آپ کو یہ خیال ہوگا کہ قبطی اور مسلمان ایک دوسرے کو کھا جائیں گے، مگر ہوٹلوں میں، تماول خانوں میں اور گھروں میں جائیے تو دیکھیے گا کہ ایک دوسرے کو نہیں، ایک دوسرے کے ساتھ کھاتا ہے۔ سیاسی اور پولیٹیکل سب دشتم مصر میں بھی ایک فن لطیف ہوگیا ہے، مگر دونوں جانب کے استادان فن عربی ہی میں اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ اور میرے خیال میں داد طلبی کے لیے یہ لازم بھی ہے شاعر کہتا ہے۔

سر بزم وہ گالیاں دے رہے ہیں — مزا لینے والے مزا لے رہے ہیں

ہم نے فرض کیا کہ سر بزم وہ گالیاں دے رہے ہیں۔ اور یہ بے حد جائے مسرت ہے لیکن مزا لینے والے تو مزا اسی وقت لے سکتے ہیں جب وہ ان گالیوں کو سمجھیں یہاں یہ کوشش ہے کہ گالیاں تو ضرور دی جائیں بغیر اس کے زندگی ایک بار گراں ہو جائیگی مگر ہم ہندی میں گالیاں دیں گے تم اردو میں اور یہی نہیں بلکہ ہمارا اور تمہارا ہر چیز میں تیل پانی کا ساتھ ہونا ظاہر کیا جائے ہم دھوتی پہنیں گے تم پاجامہ پہنو اور یہاں دیکھنا کہیں کھانا ایک جگہ نہ ہو تنہا خوری الی الابد تنہا خوری!

مصر میں دوسرا ہی منظر پیش نظر ہوتا ہے، مصر میں کیا ان تمام ممالک میں ایک ہوٹل میں آپ کھانا کھانے کے لیے تشریف لے جاتے ہیں۔ تمام خدام

یا اٹیالین ہیں، یا یونانی، یا ارمنی حسین، سُرخ و سپید لڑکے اعلیٰ درجے کا سیاہ کھانے کا سوٹ پہنے ہوئے نہایت صاف ستھرا کالر لگائے ہوئے۔ صاف شفاف قمیص جس کے کف اور فرنٹ (سامنے کا حصہ) روشنی میں چمک رہے ہیں زیب بر کیے آپ کی پذیرائی کے لیے کھڑے ہیں۔ یہ سب صاحب لوگ ہیں۔ اس بات کو آپ ہرگز نہ بھولیے گا کہ اگر آپ کی ملاقات کلکتہ میں، یا بمبئی میں ان میں سے کسی سے ہوگی تو یہ آپ سے بات بھی کرنی ہتک عزت سمجھیں گے۔ ہندوستان پہونچکر ارمنی بھی اپنے تئیں فاتحان ہند میں شمار کرنے لگتے ہیں اور یونانی بھی۔

آپ داخل ہوئے اور یہ غلامان پری تمثال دوڑ کر آئے اور آپ کو گھیر لیا، ایک کہتا ہے "اہلاً و سہلاً" ایک کہتا ہے "تفضل" ایک آپکا اوورکوٹ اتارنے میں مدد دیتا ہے، ایک نہایت ادب سے آپ کے ہاتھ سے چھڑی لیتا ہے، ایک میز کے پاس ایک کرسی کو آپ کے لیے گھسیٹتا ہے، اور فوراً کھانے کی فہرست آپکے سامنے لاکر پیش کرتا ہے آپ نے کھانا انتخاب کرکے اسے لانے کو کہا۔ وہ آپ سے استفسار کے طور پر پوچھتا ہے "نعم یا سیدی؟" آپ چونک اُٹھتے ہیں۔ ان لبوں سے "یس سر" کی توقع ہوتی ہے، اور کہتے ہیں وہ۔

"نعم یا سیدی" ایک دفعہ آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ آپ مصر میں ہیں۔ کھانا لایا
جاتا ہے۔ طریقہ انگریزی ہے، لانے والے یورپین ہیں۔ انکے دماغ سے پھر
یہ واقعہ نکل سا جاتا ہے کہ آپ پارس میں یا روما میں نہیں ہیں کہ اتنے میں حسین
آپکے سامنے، مقابل کی کرسی پر، الف لیلہ کے صفحات میں سے ایک تصویر نکل کر
آ بیٹھتی ہے اور نہایت بے تکلفانہ اور بے دھڑک طریقہ سے، "مٹن چاپ" کے
لیے حکم دیتی ہے۔ وہی "الف لیلہ" کا عبا ہے، وہی ہارون رشید کے زمانہ
کا قبا ہے، وہی عمامہ ہے اور جمال رخ روشن ہے وہی۔ اناں بایہ مولوی صاحب
اس صفائی سے بیٹھے ہوئے مٹن چاپ اڑا رہے ہیں، پاس والی میز پر دو
اور حضرات، ایک قبائے عربیت میں، ایک رخت مدنیت میں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
آ کر بیٹھتے ہیں آپ دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف بھی دیکھتے ہیں اور اپنے
دل ہی میں حیران ہوتے ہیں کہ یہ کون ہیں۔ قبائے عربی آمرانہ لہجہ میں کھانے
کو حکم دیتا ہے۔ غلمانِ جنت کے زمرے کا ایک غلام، ان کے لیے بھی کھانا لاتا
ہے۔ یہ منظر اب آپکے لیے معمولی ہو گیا ہے، آپ کے سامنے پہلے ہی سے ایک مولوی
صاحب بیٹھے ہوئے مٹن چاپ خوری کر رہے تھے، مگر یا ابوالعجائب! یہ کیا ؟
قبائے عربی کے سامنے گلاس اور بوتل لا کر رکھی جاتی ہے، اور وہ کاگ کھولکر

ایک گلاس اس عرق کا جس کا تیز بھبکا، آپ کی ناک سے گذر کر دماغ کو ٹکرا کر یہ کہتا ہے "میں شراب ناب ہوں کچھ اور نہ سمجھیے گا"۔ اپنے رفیق کوٹ پتلون والے کو دیتا ہے۔ اور پھر ایک گلاس اپنے لیے بھی بھر کر نہایت اطمینان سے غٹ غٹ پی جاتا ہے؛ یہ ذرد آشام رہے سہے حواس باختہ کر دیتا ہے۔ یہ جامۂ تقوی، یہ لباس مشرع اسلام اور علامت صراحی و جام! محتسب کہاں ہے؟ شمس کدھر ہے؟ مگر تھوڑی دیر میں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ مسلم صورت، بش صورت مسلم ہے! یہ اور اس کے آباؤ اجداد اسلام سے اسی قدر دور رہے ہیں جس قدر ریورنڈ زویمر حضرت نصرانی ہیں! اور پکے متعصب دشمن اسلام نصرانی۔ انہیں اس پر فخر ہے کہ ہمارا خاندان ظہور اسلام سے پہلے عیسائی تھا اور اب تک عیسائی ہے۔ یہ قبطی ہیں۔ نیل مبارک اسلام نے تمام مصر کو سیراب کیا مگر قبطی بادیۂ خشک ہی رہا اور اب تو اس بادیہ سے وہ جھکڑ چل رہے ہیں، اس شدت کی باد سموم اٹھ رہی ہے کہ مصر کی مذہبی شادابی معرض خطر میں ہے۔

مگر اخفائے حقیقت کا مجرم ہونگا اگر میرے اسقدر لکھنے سے آپکے دل پر یہ اثر ہو کہ مصر کے ہوٹلوں میں اسلامی لباس پہنے جو لوگ جام بکف نظر آتے ہیں وہ سب قبطی نصرانی ہیں: یہ صحیح نہیں۔ وہ سب قبطی نہیں: ان میں سے بعض قبطی

ہیں لیکن اکثر اور بیشتر مسلمانان مصر ہیں، یا یوں کہہ لیجیے کہ گویان شام ایسے ان لوگوں کا حال ہے جو اپنا پرانا قومی لباس پہنے نظر آتے ہیں ۔

رہا نوجوان مصری جو اپنے کپڑے پیرس سے سلوا کے منگواتا ہے؛ جو مراقِ فیشن میں انگریزی رنگیلے رسیلے فوجی لفٹنٹ سے بھی کئی منزل آگے نکل گیا ہے، یہ نوجوان مصری یا بقول خود ان کی اصطلاح کے،

"مصر الفتاۃ" اس کی نہ پوچھیے ۔ ان کی زندگی عجیب زندگی ہے ۔ اول تو یہ دن بھر سیر سپاٹے میں بسر کرتے ہیں، اور شام کو گھر آتے ہیں؛ آرام لینے اور سونے کی غرض سے نہیں؛ کیونکہ ان وظیفہ شناسان فرض عشرت کے قسمت میں گھر پر بیٹھنا اور آرام لینا کہاں ملتا ہے ۔ انہیں تو گھر پر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا؛ یہ صبح کے نکلے شام کو گھر آتے ہیں صرف کپڑے بدلنے کے لیے؛ پیرس کے کسی صنعت کار کے ہاتھ کا (جو درزی گری کو بھی شاعری اور مصوری کے ہمراہ فنون لطیفہ بھی شامل کیے جانیکا بجا مدعی ہے) سلا ہوا سوٹ پہنکر مصر الفتاۃ باہر نکلتا ہے ۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ ہے ۔ مگر وہ ہر شب گھر سے بھوکا ہی نکلتا ہے اور کسی رسٹاران (تناول خانہ) میں جا کر کھانا کھاتا ہے ۔ رسٹاران میں؟ میں نے غلط کہا ۔ رسٹاران کے باہر سڑک پر کھانا کھاتا ہے ۔ قاہرہ کے فیشن ایبل

بازاروں میں جائیے۔ دور تک سڑک کے دونوں طرف دوکانوں کے سامنے پٹریوں
پر قطار در قطار چھوٹی میزیں لگی ہوئی ہیں؛ گرد دو دو چار چار کرسیاں پڑی
ہیں۔ میزوں پر سفید شفاف چادر بچھی ہوئی ہے۔ دلدادگان فیشن، ان پٹریوں پر لگی
ہوئی میزوں پر جا کر کھانا کھاتے ہیں۔ خلقت جوق جوق گذر رہی ہے، یہ اس عالم
گذران کا تماشہ بھی کرتے ہیں اور کھانا بھی کھاتے ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ
میں اپنے دل میں انھیں قابل مواخذہ نہیں سمجھتا۔ مصر کے اس صاف و شفاف
نیلگوں چادر کے نیچے، اس قدرتی کوکب شامیانے کے تلے، رہنے کو جس کی
چھت میں زمرد اور ہیرے ایسی دلآویزی سے چمکتے ہیں، یوں کیوں نہ
کہوں ساکنان ملاءِ اعلیٰ جہاں سے شرارت سے یوں ساکنان خطۂ خاک کی
طرف آنکھ مارتے ہیں، انسان کا دل اس طرح بے اختیار ہو کر بیٹھنے کو چاہتا ہے
کہ مصر کی بناہائے محتشم جن کی بنانے میں فراعنۂ قدیم، اور مغرب سے آئے ہوئے
فراعنۂ حال نے اپنی ہمتیں صرف کی ہیں، اپنی طرف بلاتی رہجاتی ہیں۔

آسمان، ہمارے ہندوستان کا بھی صاف ہے اور دلکش۔ مگر کم ایسا ہوتا
ہے کہ اس گنبد اخضری میں کہیں سفید پلاسٹر سے مرمت نہ کی گئی ہو۔ آسمان مصر اپنے
پورے معنوں میں گنبد اخضری ہے آپ دوربین لگا کر بھی دیکھیں تو آپ کو لکہ بہ

نظر نہ آئے گا۔

اور اُس وقت آپ کو شاعر کا قول نہایت درست معلوم ہوگا:۔

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

میرے بعد

دنیا کی خوشی میں، سعادت و رفاہیت میں اضافہ نہیں ہوگا، مگر اندوہ و غم میں کمی ہو جائیگی۔ ایک غم آگیں دل، ایک محنت آلود وجود دنیا سے اُٹھ جائے گا۔ سفالت و رذالت، تنعم و تعیش کی جنگ قائم رہے گی، مگر سینیں کے لیے کڑھنے والا ایک دل غائب ہو جائے گا۔

میرے دوست احمد جو میرے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کے لیے طیار ہیں، جن کے ادعائے دوستی کی کوئی انتہا نہیں، جن کے اظہار لطف کے احسان سے میری گردن دبی جاتی ہے، جن کے تبسم مدام، جن کے لطیفہ ناقابل القیام سے میری زندگی تلخ ہو رہی ہے۔ یہ میرے دوست احمد باہر روئیں گے اور گھر میں جا کر قہقہہ ماریں گے۔

میرا دشمن محمود، میرا کھرا دشمن محمود، جس نے کبھی میرے پیچھے سے آکر مجھ پر حملہ نہیں کیا، جس نے ہمیشہ مجھکو میرے منہ پر برا کہا، جس سے جب میری پیٹھ پیچھے میرے متعلق سوال کیا گیا تو میری تعریف نہیں کی۔ گو چپ رہا؛ جہاں میری تعریف کی جا رہی تھی، وہاں بھی چپ رہا، جہاں میری برائی کی جا رہی تھی، وہاں بھی چپ

(۲) یہ محمود غیر متاثر نظر آنے کی کوشش کرے گا، لیکن اس کی آنکھ پُرنم ہوگی۔ رشید جس نے آج تک مجھ سے نہیں کہا کہ میں تمہارا دوست ہوں، رشید جو لاابالیانہ ڈھنگ سے میرے پاس آتا ہے اور مجھے ستاکے، ہر بات میں میری مخالفت کرکے چلا جاتا ہے، جو میرے سامنے میری ذات کے متعلق کوئی بات نہیں کہتا، لیکن جہاں میں نہیں ہوتا ہوں تو میرے لیے لوگوں سے یہ کہکے لڑتا ہے کہ "میں اس کا دوست نہیں، اور میں اُسے اچھا نہیں سمجھتا، لیکن خواہ مخواہ بُرائی بھی نہیں سن سکتا"۔ رشید جو دوستی، رفاقت وصداقت کی ہنسی اُڑاتا ہے، اور ہر جگہ کہتا پھرتا ہے کہ یہ سب بے معنی الفاظ ہیں جو احمقوں کے بہلانے کے لیے تراشے گئے ہیں، رشید میرے بعد پھوٹ پھوٹ کر روئیگا، پھر کہے گا کہ "یہ میرے دل کی کمزوری تھی، میں بیوقوف ہوں، میں عورت ہوگیا" پھر خوب ہنسنے کھیلنے کی کوشش کرے گا، ہنسے گا، کھیلے گا، لیکن مہینوں کے بعد، برسوں کے بعد، جب کبھی کسی محفلِ طرب، کسی جلسۂ عیش میں میرا ذکر آجائے گا، تو رشید اُٹھ کے کسی کام کے بہانے سے بھاگ جائے گا، تھوڑی دیر کے بعد سیٹی بجاتا ہوا، گاتا ہوا واپس آجائیگا لیکن آنکھیں سُوجی ہوں گی، پپوٹے لال ہوں گے۔

یہ سب کچھ تو ہوگا، مگر اے دوست اے وہ کہ جس کی نگاہِ لطف کے لیے

میں ترستا ہوں جس کا تبسم مجھے دنیا کی نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ اے دوست!
یہ تو بتاؤ، تم بھی میرے لیے دو آنسو بہاؤ گے کہ نہیں؟

ویران صنم خانے

بچپن! بچپن کا پرستشکدہ! جس کا گنبد نیلگوں تھا۔ ستاروں کی جیسی قندیلیں لٹکی ہوئی تھیں وہ قندیلیں جو ہماری تمناؤں کے ساتھ جھلمل جھلمل کرتی ہوئی اور ہماری طرف دیکھتی ہوئی جانی پہچانی آنکھیں سرگشتی تھیں جن میں ہوا، ایک بازو میں امید، ایک بازو میں بیم لیے ہوئے قریب آتی تھی اور کسی کو بے آرام کرتی ہمیں تو لوریاں دیتی تھی۔

ہر سبزہ زار سے، ہر دل سے راگ، رنگین سمندروں سے ساز ہائے موسیقی۔ اس پرستشکدہ تک آتے تھے۔ معبد طفلی! ہم تمام پھولوں سے، درختوں سے، میدانوں سے باتیں کرتے تھے، اور تمام جھینگر، اور مینڈک، اور چھوٹے چھوٹے پرندے ہمارے ساتھ شریک ہو کر اس پرستشگاہ میں پرستش کرتے تھے۔ اے معبد طفلی! تیری ایک بلیغ زبان بھی جو ہماری روح کے تمام جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتی تھی۔ کسی معبد کا سنگ در تجھ جیسا شفاف نہیں، کوئی معبد ایسی آہنگ شیریں سے بھرا ہوا نہیں، نہ کسی کی زمین پر ایسی چکاچوند کرنے والے رنگوں سے پچی کاری کی گئی ہے اور یہاں کوئی پرستشگاہ ایسی نہیں جہاں عظمت و قدرت الٰہی کے ساتھ غضب الٰہی

ایسے سیاہ رنگوں ایسی خوفناک آوازوں سے قلب پر مستولی ہوتا ہو۔ کونسا معبد ہے کہ جسکی دیواروں کے اندر معبود ایسا ضیا دار ہو اور اس ستاروں بھرے فرزین عباء میں دمکتا میں خود پجاری بھی چمک رہا ہو۔ اور روز افزوں لذتِ حیات سے متلذذ ہو۔

رات کو تیری متبسم اور ساکت قندیلوں کے سائے میں تیری مدہم اور مبہم روشنیوں میں کائنات کی تھکی ہوئی آواز کو سُن کر ہم سوتے تھے، اور دن کو تیرے اُس نور میں جاگتے تھے جو فضا کو روشن کئے ہوئے ہوتا تھا اور کائنات کے ساتھ ہمیں بھی آغوشِ نور میں لے لیتا تھا۔ ہم کیسے اور کیوں پرستش کرتے تھے ہمیں خبر نہ تھی مگر سادہ حسِ حیات ہماری تازہ تھی اور ہماری ہر اک حرکت ایک نماز۔ اسقدر صمیمی اسقدر شدید زندگی، وہ زندگی جو صرف زندہ رہنے کے قدرتی لطف اُٹھانے کے لیے ہو کیا پرستش کی پہلی شکل نہیں ہے؟ اس سے زیادہ صحیح اس سے زیادہ طبعی پرستش کیا ہو سکتی ہے؟ اس خوبصورت معبد میں ہر دن ہماری زندگی میں نئی عجائبات پیش کرتا تھا اور ہماری روح کو ایک تازہ مسرت انگیز لرزشِ حیات بخشتا تھا اور ہم ایک غیر اختیاری وجد کی حالت میں گویا سجدہ ہائے پرستش کرتے تھے۔

ہمارا پہلا معبد۔ معبدِ طفلی! چند سال ہم نے تیرے گنبد کے نیچے پرستش میں

گذارے، تیری پوجا کی۔ بعد میں جب دوسرے معابد میرے سر پر آ کر گرے اور
میری روح پریشان اور نا امید ہوئی اور میرا دل کسل اور فتور سے بھرا تو میں نے
ہمیشہ تیری قندیلوں کی روشنیوں میں جا کر پناہ لینے کی کوشش کی۔ مگر آہ! تو بھی
اُن معبدوں ہی کی طرح بیجان و خاموش ہو گیا۔ تیری قندیلیں میری روح تک نہیں
پہنچتیں۔ تیری نسیم لوریاں نہیں لاتی، بلکہ وہ اب ایک نابینا قدرت کا جھکڑ ہے
جو درختوں کو اُکھاڑتا ہے نشیمنوں کو ویران کرتا ہے تیرے آبشاروں سے اب کوئی
موسیقی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ وہ ایک آوازۂ یاس ہی جو یتیم انسانیت کے جگر سے نکل رہی
ہے یا وہ انسان کی صدائے الامان ہے جسے کہیں امان نہیں۔ جا تجھے بھی خراب ہونا
تھا اے معبد! تو خراب ہو ہی چکا۔ تیری قندیلیں بجھ گئیں اور تیرے مرغزار سوکھ گئے تیرے
معطر و سرسبز چشمے تپتے ریگستان ہو گئے تو بھی ایک تاریک اور ویران عالم ہو گیا۔ اس
کھنڈر میں بیٹھکر میں اپنے معبد کا ماتم کر رہا ہوں۔

عشق و محبت کے بت! اِن فانی معبودوں کے لیے کون ہے جس نے معبد نہیں
بنائے صنم خانۂ عشق بھی کیسا رنگین ضیاء دار معطر صنم خانہ تھا۔ وہ کیسے صاف شفاف
قبۂ بلور کے ذریعہ تاروں کی چمک شفقوں کے رنگوں کو بڑھا بڑھا کر اپنے میں لیتا تھا۔
اُس کے حجروں میں سے جو نغمے سنائی دیتے تھے وہ ایک دوسرے سے محبت کرنیوالے

دلوں کے ترانے تھے۔ اس معبد میں وہ نوجوان جمع تھے جو پھولوں سے لدے پھندے تھے جن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور جن کی روح عشق کی وجہ سے رقصاں۔ مگر اس کی محراب میں میں نے ایک نوجوان دوشیزہ دیکھی جس کا چہرہ سالہا سال کے انتظار سے اپنی تروتازگی غائب کر چکا تھا جس کی آنکھوں میں حزن و ملال نے مستقل طور پر جگہ کر لی تھی۔ یہ بیوقوف لڑکی اپنے حبیب کا انتظار کر رہی تھی جو اُسے کبھی نہ ملے گا۔ اس نے میرے سامنے جان توڑ دی، اور میں نے اُسے معبد کے دروازے میں مٹی کے اندر دفن کر دیا تاکہ وہ روندی جائے۔ اُن شیشے کے ٹکڑوں کو جنہیں وہ بلور سمجھے ہوئے تھی۔ میں نے اس کے مدفن پر ڈال کر ایک نہایت سیاہ اور نہایت موٹی چادر سے اسے ڈھانپ دیا۔

سب سے بیہودہ، سب سے زیادہ مضحک اور سب سے زیادہ دھوکا دینے والا معبد ہے معبدِ عشق۔ جہاں چار آنکھیں، اشارات محبت کر رہی ہوں اور دعوتِ عشق دے رہی ہوں، وہاں میں نے دو آنکھوں میں ضرور دھوکا اور خیانت پنہاں دیکھی۔ جہاں دو ہاتھ ایک دوسرے کو محبت سے دبا رہے ہوں وہاں ایک ضرور دوسرے کو فریب دے رہا ہے۔

طفلیٔ وعشق کے ویران معبدوں کو چھوڑ کر میں آگے بڑھا، اُنکار و احساسات

کے نادیدہ افقوں کی طرف، زندگی دُونی تیزی کے ساتھ مجھے لے گئی اور میں نے
دوسروں کے معبد کے دروازوں میں سے اندر جھانکا۔ مگر میری نگاہوں نے نہایت
گہرے پردوں میں سے گذر کر دیکھا تو یہ دیکھا کہ ہر جگہ ویران معبدوں کے سوا کچھ
نہیں۔ ہر قلب نے یہی کہا کہ میں کبھی تجلی گاہ ارمان تھا لیکن اب نہیں وہ خلوص
جن کے لیے حکما سر کھپا رہے ہیں وہ سوز و گداز بشری جن کی ترجمانی شعرا کرتے
رہے ہیں، دوستی، عشق، دین، فکر بشر سب کے سب آخر میں دیکھے تو ویران معبد
ہی نظر آئے۔ دماغ و قلب کے ویران چشم فنا نے! اب ان میں حسرت
و یاس و تمنا سیر کرتے ہیں۔

ز۔ خ۔ ش [۱]

وہ عندلیبِ خوش الحان جس کے عرفان پاش نغمے اُس کی قفس کی تیلیوں سے نکل نکل کے ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے، یکایک خاموش ہو گئی۔ نغمے فضا میں متلاطم ہیں، مگر عندلیب ہمیشہ کے لیے ساکت۔

وہ حقیقت طراز مگر شیریں آواز سرِ پردۂ دولت کے پیچھے سے (جہاں سے بے معنی خندہ اور فضول مکالمہ کے سوا کچھ کم سنائی دیتا ہے) سُنا رہی تھی کہ صدق و صفا، علم و عرفان، سوز و التہاب، درد و گداز کیا ہیں۔

اور صدق و صفا، علم و عرفان، درد و گداز سوگوار ہیں کہ ان کی مشاطہ اُن کو دلآویز آرائشوں میں اب پیش نہ کرے گی۔

وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی، قفس ہی میں جی۔ اور اُس نے قفس ہی میں دم توڑا۔ اُس چند گز نیلگوں آسمان کے سوا جو اُس کے صحنِ خانہ پر حسرت بار رہا، اُس نے فطرت کی زیبائش، آفریدۂ دستِ انسان کی آرائش نہ دیکھی، آفتاب جو دُنیا کو زندگی اور حرارت بخشتا ہے قفس کی تیلیوں سے لپٹے ہوئے کپڑے سے گذر نہ سکا۔ لیکن خود اُس کے قلبِ منور نے ایک شمع روشن کی

---

[۱] اردو کی وہ مشہور شاعرہ جس کی حیرت انگیز قدرتِ کلام طبقۂ نسواں کے لیے باعثِ صد افتخار تھی اور جس کی بے وقت موت نے اردو علم ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ مرحومہ عالیجناب سر مزمل اللہ خان بہادر (دہلی) کے سی آئی ای رئیس بھیکم پور کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔

جس نے اُسے باہر کے نور سے بے نیاز کر دیا۔ شمعِ تخیل!

وہ اپنی مختصر مگر متجلی زندگی میں اپنے تئیں "فکرنشیں ز۔ خ۔ ش" کہا کی۔ آج حقیقتاً وہ خاک نشینی کی آرزومند آسودۂ خاک ہے۔

"خوش درخشید گر شعلۂ مستعجل بود"

اے مادرِ وطن

اک ترک کا خطاب اپنے وطن سے

تیرے بچے، مصیبت و فلاکت کے سمندر کی سب سے زیادہ تاریک گہرائیوں میں ڈوب رہے ہیں، اُن کے سینوں سے خون کے فوارے نکل رہے ہیں، اور وہ دل خون اور سینہ چاک تیرے بہر گز زمر قلب میں جمع ہوئے ہیں۔ اپنے سینہ کو کھول، اے تیرہ خاک! اور اپنے شہیدوں کے لیے جنھوں نے تیرے چھوٹے سے روڑے کی خاطر، لمبے لمبے زخم کھائے مگر دشمن کو تجھ سے دور رکھا، ہمارے بہادر آباؤ اجداد کے پہلو میں جگہ تیار کر۔

تیری متروک، تیری خشک، تیری فراموش شدہ پتھریلی وادیوں کو سفید ریش بڈھوں سے لے کر معصوم ترک بچوں تک کا اپنے آنسوؤں سے تر کرنا کیا کافی نہیں ہے؟

کیا تو ہم سے ناراض ہو گئی، اے مادرِ وطن؟ اس بےگناہ، اس مردِ قوم سے نہ پوچھ کہ کن قزاقوں نے، کن نائیوں نے اپنے پاؤں سے تجھے پامال

کیا تیری ہڈیاں توڑیں، کن درندوں نے اپنے ناخنوں سے تجھے مجروح کیا۔
اے مادرِ وطن! تو جو نیلی موجوں کی آغوش میں سو رہی ہے۔ تو جس کے پہاڑوں
کے خطوط نازک، جس کا سایہ رنگین، جس کا افق رنگین، جس کا سماں شفق گوں،
جس کی سحر لطیف، جس کے بادلوں کی رفتار دلبر و دلکشی آور ہے، تو ہمیں یتیم
چھوڑ کر کن بیگانہ درندوں کے تعاقب میں جا رہی ہے۔

سن! تجھے نہ تحقیر قدیم روما، نہ فیلسوف قدیم یونان نے ایسے وفاکار،
ایسے آتشیں، ایسے نفس والے ترک کے فرزند دیا ہے جیسا ہم چاہتے ہیں
اور نہ کوئی قوم مستقبل میں پا سکتی ہے۔ ترکوں کی سب سے زیادہ دلدوز
خشوع و تضرع ترکوں کے عجز و تجرد، یہ استغراق تیرے لیے ہیں، ترک
تیرے لیے زندہ رہتا ہے، تیرے لیے مرتا ہے، تیرے لیے برباد ہوتا ہے،
تیرے لیے آہ و زاری کرتا ہے۔ سب تیرے لیے۔

کسے معلوم ہے کہ تیرے خمیر میں کتنے ترک شہدا کا خون ہے جنہوں نے
اپنے قیمتی قطرہائے خون تیرے سینے پر گرائے، کتنے ترک سپاہیوں کی ہڈیاں
ہیں، جنہوں نے اپنی جان و شان تیرے قدموں پر فدا کر دی۔ تیرے
سینے پر جان دینے کے لیے، اور اپنی ہڈیاں تجھے سپرد کرنے کے لیے صدہا

سال ہا تک، غربت زدہ، آبلہ پا اور دیہا خستہ درماندہ کس پرسی پر روند دیا گیا ہو
ترک آئے گا۔

اس خطرناک زمانے میں، وہ باعظمت ترک فاتح جو تیرے لیے شہید ہوئے اور جنہوں نے تیرے لیے مرنا ہی اپنی مکافات سمجھی، ان کی روحیں تیری لطیف ہوا میں، تیرے افق پر جہاں دشمن کے تاریک سائے پڑ رہے ہیں بکھر رہی ہیں ماضی کی وسعت میں سے یہ خاموش، گرد قدور و مغموم روحیں آ رہی ہیں اور تیرے زندہ فدائیوں کی پیشانیوں کو اپنے پراں بازوؤں سے مس کرتی ہیں۔

ہماری قسمت میں اگر جینا ہے، تو تیرے لیے جینا ہے، لیکن اگر قسمت میں یہ ہے کہ ہمارے قلب کے نازک ترین احساسات کو دشمن اپنے ہاتھوں سے ٹھیس لگائے۔ تو بہتر یہی ہے کہ ہمیں مار ڈال اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اے تیری خاک! اپنے میں دفن کر لے۔

اے اور وطن! جو دن تیرے لیے خطرے کا دن ہو، اس دن وہ معصوم سر جو پالنے میں بلند ہو رہے ہیں، ان سے لیکر ان کمزور دلوں تک جو مزار کی طرف جھک رہی ہیں سب اپنا خون تیرے لیے بہانے کو تیار ہیں۔ اس دن

وہ موت کے ڈراونے چہرے سے اُلفت کرتے ہیں۔

اے کمال کی ماں، مدحت کی ماں، اے فاتح اے سلیم کی آغوشِ خواب!
اگر تیرے پاک گوشوں میں تیری نفرو دعا ف مرسیت میں کسی بے ادب کی
قدم داخل ہو جائے، تو ہم سب، ہمارا سرفروش انور، ہمارا بہادر نیازی،
ہمارا مصطفےٰ کمال اعظم، ہماری شیر فوج کے ساتھ مرد و عورت، یتیم بچے،
سب کے سب اس نجس اجنبی قدم کو تیرے پاک سینے سے ہٹا دیں گے لیکن اگر
نہ ہٹا سکیں تو ہم تیرے سب سے گہرے گڑھے میں گر جائیں مگر اس وقت تو ہمیں ایسا
گہرا گاڑ دے کہ تیرے نرم سینے میں دشمن کے ناخن پڑیں تو ہمیں احساس نہ ہو۔
نہیں نہیں اگر تو ہماری ماں ہونے سے گریز کرتی ہے تو تو بھی ہماری طرح
محو ہو جا۔ اپنے شاندار محلوں، اپنے اونچے گنبدوں، اپنے پر اسرار جنگلوں، اپنے
شاداب مرغزاروں سمیت محو ہو جا۔

تھر دنیا کی سب سے تاریک، سب سے دور تنہائی میں جا سو۔
نہ انسان کے حافظے میں، نہ کتابوں کی سیاہ تحریر میں تیرا نام و نشان باقی رہے
ہم سب کے ساتھ، تو بھی اُن معموروں کی طرح جو راکھ ہو چکے ہوں، اکتم عدم
میں چھپ جا۔

ایک دوست کی خبرِ وفات سُن کر

سنہ ۱۹۰۱ء

میں تم پر بے وفائی کا الزام نہیں لگاتا، کیونکہ ہم اب بھی جدا اور ایک دوسرے سے دُور تھے۔ بدعہدی کا مجرم نہیں ٹھہراتا، کیونکہ ہمیشہ ساتھ رہنے کا ہمارا تمہارا کوئی عہد و پیمان نہیں ہوا تھا۔ مگر اے دوست، سکوت و کوتاہ قلمی کا الزام لگاتا ہوں۔ میرے خط کا جواب تو دو، ہماری بحثیں ابھی ناتمام ہیں۔ میں نے اپنے دلائل تمہیں لکھ کے بھیجے ہیں، انہیں رد تو کر دو۔ کیا ہار مان گئے؟ ہم تم ویسے ہی ایک دوسرے سے بہت دور تھے، اس سے بھی زیادہ دور چلے جانے کی کیا ضرورت تھی؟

اگر تم اپنے خیالات، اپنے حسیات مجھ سے چھپاتے نہیں رہے، تو میں کہہ سکتا ہوں تمہیں دو چیزوں سے اُلفت تھی: حُسن اور شاعری۔ تم سا حسن پرست اور شاعریت دوست وہاں بھی کیا حسبِ دلخواہ اپنے اشغال میں مصروف رہ سکے گا؟ مانا کہ حسن وہاں بھی تمہیں نظر آئے گا، اور مکمل حسن، لیکن کیا حوریں تمہاری نقاد طبیعت کو بہلا سکے گی؟ سرمگیں آنکھوں، عنبریں زلفوں کے

، تجھ سے بیزار ہو کر، کیا تمہاری تنوع پسند طبیعت (اور کون سا ذکی الحس انسان
ہے جو تنوع پسند نہیں؟) گیسوئے تابدار اور چشم نیم باز کو یاد نہ کرے گی؟
پھر وہ حسن ایسا ہی ہوگا نا جو نظر باز ہو، جو نکتہ چیں آنکھ سے بھی قبول لے
کہ بے عیب ہے، لیکن وہ حسن تو نہ ہوگا جس میں شاعریت (احساس جاذبیت)
اور ہمدردی بھری ہو، جو تمہارے خیالات سے متحسس ہو، اور اپنے
خیالات سے تمہیں متحسس کرے، اپنے اشعار کس کے لیے لکھو گے، وہاں تو شاعری
درکار نہیں، حسن مغرور تمہیں پسند تھا، اور میں اپنی کشش اور خوبی سے بے خبر
حسن کا شیدائی تھا، ہم میں اس کے متعلق بحثیں ہوتی تھیں گو میں سمجھتا ہوں کہ میں
اپنی رائے تم سے منوا لونگا، مگر یہ کیا؟ تم اس نامعقول حسن کے جو نہ مغرور رہی
نہ بے خبر، بلکہ جو زیبائی و زشتی کی تمیز ہی نہیں رکھتا، دل دادہ ہوگئے!

ہجوم میں تنہائی

مئی ۱۹۵۳ء

دوست، دوست سے، محبوبہ عاشق سے، یا بالعکس، عاشق محبوبہ سے جدا ہو رہا ہے۔ ہار پہنائے جا رہے ہیں، گلدستے پیش کیے جا رہے ہیں۔ لنگر اٹھا۔ جہاز آہستہ آہستہ ساحل سے ہٹنا شروع ہوا، رخصت کرنے والوں کی، ساحل اور ڈک پر صفیں کھڑی ہو گئیں۔ رومال کبھی آنکھوں پر جاتے ہیں، کبھی ہلتے ہیں، کوئی مسکرا مسکرا کر جانے والے کو ساحل پر تھما رہا ہے، جانے والا ساحل کے دوست کو اشارے سے ڈک پر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ پرنشہ وداع، حزیں فراق، دونوں یہاں موجود ہیں۔ جہاں ہر طرف مصافحے، معانقے ہو رہے ہوں وہاں اپنا ہاتھ جیب میں ہونا بھی عجیب دل پر اثر کرتا ہے۔ ہجوم میں تنہا ہوں!

ان سینکڑوں رومالوں میں، میرے لیے ایک میں جنبش نہیں۔ اور نہ میرا ہاتھ، رومال کو اس کے آرام کی جگہ سے، کسی کے لیے باہر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

جس طرح کسی دوسرے سیارے کا باشندہ ہمارے حرکات کو بے پروایانہ انداز سے دیکھتا ہوگا۔ اسی طرح میں اس جہاز کی حرکات پر نظر ڈال رہا ہوں۔ انداز بے پروایانہ ہو مگر نظر رشک آمیز ہے۔

ساحل دور ہوگیا، دوربینیں آنکھوں پر لگ گئیں، جنہوں نے بمبئی کے دل آویز منظر کو قریب لا کر دکھانا شروع کیا۔ جہاز کے طاقت ور انجنوں نے یہ منظر بھی آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔ اب صرف حدِ افق تک، نیچے سمندر کی نیلگوں سطح ہے، اور اوپر آسمان کا نیلگوں شامیانہ۔ اب ہماری دنیا اس مرکب بحری سے مراد ہے۔ کم از کم ایک ہفتے کے لیے خشکی کی دنیا کی جنگ و جدل صلح و آشتی، کوشش اور ارمان، نتیجہ اور حرمان سے ہم بے خبر رہیں گے عدن پر کچھ گھنٹوں کے لیے، دنیا سے رشتہ جڑے گا، اور پھر وہی بے تعلقی۔

اے دوست، بیا، رحم بہ تنہائی من!

قسطنطنیہ

مقام جمہوریت

۱۹۲۳ء

پھر وہیں لے چلا مجھے دیکھو دلِ خانہ خراب کی باتیں

دیارِ مغرب کی سیاحت ختم ہوئی۔ آنکھوں نے سب کچھ دیکھا۔ آثارِ قدیمہ، تحریکاتِ جدید، سکون ناآشنائی، کام زنی، شبانہ روز سر تہ تگ، پرستش زر، غرور مدنیت، امتیاز و تحکمِ نسل و قوم ان سب نے دل پر گہرے اثر چھوڑے ہیں۔ ہاں اے یورپ!

گفتگو آئین درویشی نبود ورنہ با تو ماجراہا داشتیم

اب اپنے محبوب، شرقِ قریب کی کشش، مجھے مغرب کی طلسماتی سیمابی زندگی سے چھڑا رہی ہے، افق پر ہلال مجھے ہلال باسفورس کی یاد دلا رہا ہے اور اے کہنہ شہر بائزنٹیم![1] تیری جاذبیت ناقابلِ مقاومت ہے، بارہ سال قبل تو نے مجھے بلایا اور میں افتاں و خیزاں "لبیک لبیک یا حبیبی، یا محبوبی" کہتا ہوا، پہونچا ترے اشارہ ابرو نے پھر مجھے بیتاب کر دیا، سلطنت، مشروطیت، خلافت، جمہوریت! تیری ہر ادا بانکی ادا ہے،

[1] قسطنطنیہ کا پرانا نام

من انداز قدت را می شناسم

سلطنت ہو یا خلافت، مشروطیت ہو یا جمہوریت تم تو تم سے پریشانِ قدیم ہیں صبح کے وقت ٹرین قرہ آغاچ پر ٹھہری، یورپ سے آنے والے لوگ ادرنہ (ایڈریانوپل) کے لیے اس اسٹیشن پر اترتے ہیں۔ میں ٹرین سے نکلا اور خاکِ عثمانی، (توبہ توبہ بڑی غلطی ہو گئی، کہیں کوئی جوشیلا ترک اس عبارت کو نہ دیکھ لے، لفظ عثمانی ممنوع ہے) خاکِ ترکی پر قدم رکھا اور ادرنہ نے میرے گذشتہ سفر ترکی کے بعد کیا کچھ نہیں برداشت کیا (بلغاری)، یونانی ستم رانی اس کے نصیب میں تھی لیکن آج پھر وہ اپنے وارثوں کے پاس ہے ایک دن ادرنہ میں ٹھہر کر میں دوسرے دن شام کو استنبول (قسطنطنیہ، درِ سعادت (جو چاہیے کہیے مگر خبردار دارالخلافت نہ کہیے گا) پہونچا۔

میرے سفرِ اول، اور اس سفر کے درمیانی زمانے میں یہاں کی زندگی میں کس قدر عظیم فرق ہو گیا ہے۔

استنبول اور پیرا کو ملانے والا پل جو شاخِ زرین پر کشتیوں کا بنا ہوا ہے، پہلے معمولی بلکہ ادنیٰ درجہ کا تھا، اب نہایت نفیس اعلیٰ صنعتکاری کا نمونہ ہے، مگر سڑکوں کی وہی حالت ہے شکستہ و ریختہ۔

ترکی ٹوپی یا فیز پر پہلے ... ٹوپی سے نہایت مشابہ ... پہنے ہوئے ہیں، لیکن انہیں چھپا نہیں سکا، اس طرح سے ترکی ٹوپی سے تغیر ہو گیا ہے، جیسا سے زیادہ تغیر جو آنکھ کو فوراً محسوس ہوتا ہے یہ ہے کہ کھل کھل ہو گئی ہیں، غنچے جو گھنڈیوں میں بند تھے، چٹک کر باہر نکل آئے، یعنی ترکی خاتونوں نے نقاب چہروں سے ہٹا دیا ہے، اور اب وہ ترکی کی حیات مشترکہ میں شریک غالب نہیں تو شریک مساوی ضرور ہیں، پاؤں سے لیکر گردن تک لباس، بالکل یورپین لباس ہے، پیرس کے تازہ ترین قطع و فیشن کو دیکھنا ہو تو ترکی خاتون کو دیکھیے لیکن ابھی تک مرد اور عورت ایک بات پر سختی سے قائم ہیں، انگریزی یا یوروپین ٹوپی نہ مرد پہنتے ہیں نہ عورتیں، عورتیں سر پر نہایت خوبصورتی سے رومال، باندھتی ہیں، جو اتنا مقبول ہوا ہے کہ میں نے یہاں بعض یوروپین یا عیسائی عورتوں کو اس کی تقلید کرتے دیکھا، ایک اور بات پر نظر اٹکتی ہے، ترکی خاتونیں بلا استثنا چشمہائے سرمہ آلود سے آپ نظر ڈالتی ہیں —

بہیں ظالم حیا کردی بلا اندر بلا کردی

میں نے اور باتوں کا ذکر نہیں کیا، اور شروع ہی میں ترکی خاتون قسطنطنیہ کے متعلق لکھنا شروع کر دیا، اصل یہ ہے کہ یہ تغیر اس قدر عظیم ہے کہ

میں قدم رکھتے ہی اسے تغیر عظیم نظر آتا ہے۔

میرا اینڈریا نوپل میں صرف ایک دن رہا، مگر حق یہ ہے کہ اینڈریا نوپل والوں نے غریب نوازی اور مہمان پروری کا پورا حق ادا کر دیا۔ میں ہوٹل میں اترا ہی تھا، کہ پولس نے (جس نے اسٹیشن پر میرا پاسپورٹ مجھ سے لے لیا تھا) ولایت ادرنہ کے حبیب بے مدیر معارف (ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن) کو خبر دی کہ ہندوستان کی مسلم یونیورسٹی کا ایک آدمی آیا ہوا ہے۔ مدیر معارف نے فوراً ایک شخص میرے پاس بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں وقت مقرر کیجئے میں بجائے وقت مقرر کرنے کے اس شخص کے ساتھ ہولیا اور میں نے کہا کہ میں خود ان کے پاس جاؤنگا۔ دائرہ حکومت (گورنمنٹ ہاؤس) میں حبیب بے نے مجھ سے بے انتہا اخلاق کے ساتھ ملاقات فرمائی ہندوستان کی تعلیمی حالت کے متعلق سوالات کرتے رہے اور میں ٹرکی اور ولایت اینڈریا نوپل کی تعلیمی حالت کی نسبت پوچھتا رہا۔ اس کے بعد حبیب بے نے اپنے دفتر میں سے ایک صاحب کو بلا کے میرے ہمراہ کر دیا کہ انھیں ادرنہ کے تمام اسکول دکھاؤ، چنانچہ میں نے ان صاحب کی اور سامی بک مدرس علوم طبیعیہ و اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول ادرنہ کی معیت میں

یہاں کے تمام مدارس اور ... دیکھے۔ کمال اتفاق سے ہر اسکول کے
منیجر نے مجھے اسکول دکھائے اور وہاں کے حالات بتائے۔ سامی
ایک دن مجھ سے میرے ساتھ ... ملنے آئے۔ شام کو "جمہوریت" کے ایک کارسپانڈنٹ
نے آکر مجھ سے ملاقات کی اور اس ملاقات کا مفصل حال "جمہوریت"
میں چھپوایا۔ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق تفصیلات بیان کیں اور
بتایا کہ ہندوستان میں کون یونیورسٹیاں ہیں طریق تعلیم کیا ہے وغیرہ وغیرہ
"جمہوریت" استنبول کا ایک روزانہ پرچہ ہے۔

استنبول میں دو دن ... تک میں کس مپرسی کی حالت میں رہا۔ تاہم میں احسان مند
ہوں کہ استنبول میں ہندوستان کے ہندوستانیوں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا
اور مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ استنبول میں دس بارہ ہندوستانی ہیں جن میں سے
ایک سکھ بھی ہیں الحمدللہ کہ ایک ہندوستانی یہاں بہت باعزت ہیں، یہ
عبدالرحمن ہیں جو ڈاکٹر انصاری صاحب وفد ہلال احمر کے ساتھ جنگ بلقان
میں آئے تھے، اور یہیں رہ پڑے، یہ علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ ہیں لہذا
عبدالرحمن (علیگ) ہیں اور اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ محبت مروت، اخلاق
میں یہ استنبول علیگ ان محاسن کا مجسمہ ہے۔

جرمنی میں ایک انگریز سے ملاقات ہوئی جو حال ہی میں سفر قسطنطنیہ
سے واپس آئے تھے، چونکہ میں بھی اس سفر پر جانے والا تھا اس لیے
قدرتی طور پر میں نے ان سے وہاں کے حالات پوچھے کہ مجھے سفر درپیش
ہوا انھوں نے کہا کہ اس وقت ترک نیشنلزم (قومیت) کے نشے میں سرشار
ہیں میں نے اس وقت تو یہ سمجھا تھا کہ یہ ایک مبالغہ آمیز رائے ہے مگر خود
یہاں پہنچکر مجھے اس رائے کی صداقت میں ذرہ برابر بھی شبہہ نہیں رہا
ترک اس وقت نہ صرف اس نشے سے مست ہیں بلکہ روز بروز اس مئے
دوآتشہ کے زیر اثر مدہوش تر ہو رہے ہیں۔

ترکیت کی پرستش کی جا رہی ہے اور اس پرستش میں وہ مدنیت
حجازی پر بعض اوقات سخت حملے کر جاتے ہیں جو میری طرح باہر کے مسلمانوں
کو بہت گراں گذرتے ہیں۔ وہ اس وقت عرب کا نام نہیں سن سکتے اور
حق یہ ہے کہ گذشتہ جنگ عمومی میں عربوں سے جو ضربہ عظیم ان کے سر پر
پڑا ہے اس نے انھیں بالکل بیجان کر دیا تھا وہ محو ہو چکے تھے۔ خدا کو اپنی قدرت
کاملہ دکھانی منظور تھی کہ اس نے مردہ ترکی کو پھر زندہ کر دیا اور اس طرح
زندہ کیا کہ وہ ایک جوان رعنا کی طرح جولان ہے۔

ہر ملک و قوم کی طرح، ترکوں میں بھی ایک انتہا پسند گروہ ہے جو ترک
عرب، اہل عرب، مدنیت عرب سے ایسی بیزاری ظاہر کرتے ہیں کہ خیال ہونے لگتا
ہے کہ وہ دین عرب سے بھی بیزار ہیں اس وقت اس انتہا پسند گروہ کے حیات
کے ترجمان واصف بک ہیں جو وزیر تعلیم ہیں۔ الغائے خلافت میں ان کا سب
سے زیادہ حصہ ہے کہنہ خیال علماء کو وہ چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ طرز قدیم
کے مدارس کو انہوں نے بجبر بند کرا دیا حال میں معلمین ترکی کی ایک کانفرنس
ہوئی اس میں انہوں نے کہا کہ مدنیت عرب نے ترکی قوم کی شخصیت کو مٹا دیا۔
ہمیں اس کی غلامی سے آزاد ہونا چاہیئے۔ ہماری زبان، ہماری معاشرت سب کچھ
تمدن عرب نے ہضم کر لی۔ دو دن ہوئے کہ خود مصطفےٰ کمال پاشا نے ایک تقریر
میں یہ خیالات ظاہر کیے۔ جنگ استقلال میں (یونانیوں سے جو جنگ ہوئی ہے
اُسے ترک جنگ استقلال کہتے ہیں) ملت نے اپنی وراثت حاصل کی۔ قوم اپنے
اُوپر خود حکومت کرنے کے لیے آزادی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ گئے وہ دن جبکہ
سلطان، خاقان، خلیفہ غیر ترکی عناصر کی مدد سے ترکی قوم کو دبا کر حکومت کرتے تھے۔
غیر ترکی عناصر سے اشارہ زیادہ تر عربوں کی طرف ہے۔ نفرت اس درجہ
بڑھی ہوئی ہے کہ ترک اس وقت اس کے خلاف ہیں کہ کوئی حج کو جائے مجھے یقین ہے

کہ یہ نشہ دعارضی ہے اور تھوڑے دنوں میں ان خیالات میں نرمی آ جائیگی
حکومت کا رعب اس وقت اس قدر غالب ہے کہ یہاں کوئی شخص
خلافت کا نام بھی نہیں لیتا۔ جو حضرات مجھ سے گفتگو کرتے ہیں میں محسوس
کرتا ہوں کہ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں اس معاملے کے
متعلق عام رائے کیا ہے مگر نہیں پوچھتے۔ ٹرکی سے باہر جتنے ترک مجھے ملے
تھے، اُنھوں نے اس کے متعلق مجھ سے نہایت آزادی سے بحثیں کیں۔
مگر یہاں خاموشی ہے۔

حق پوشی ہوگی اگر موجودہ جمہوری حکومت کی (جس نے دین و حکومت
کو علیحدہ کر دیا ہے) چند اصلاحات و احکامات کا ذکر نہ کیا جائے جس سے
اس "بیدین" حکومت کا طرزِ عمل ایک غیر متوقع جلوہ دکھاتا ہے۔ زمانۂ خلافت
میں یہاں یہ سماں نظر آتا تھا کہ اتوار کے دن تمام بازار بند ہیں۔ اکثر دفاتر
بند ہیں اور جمعہ کو بازار کھلے ہوئے ہیں؛ وجہ اس کی یہ تھی کہ بنک اور تمام بڑی
بڑی دکانوں کے بند ہونے سے ایسی کساد بازاری ہوتی تھی کہ مجبوراً اس روز
مسلمان بھی دوکانوں کو بند کر دیتے تھے برخلاف اس کے جمعہ کو دوکانیں کھلی
رہتی تھیں۔ عہد جمہوری میں، میں نے دوسرا ہی رنگ دیکھا حکومت کے حکم سے۔

اور یہ حکم قطعی ہے جس میں استثنار کی گنجائش نہیں۔ تمام بنک اور دکانیں جمعہ کے روز بند ہوتی ہیں یعنی اب حقیقی معنوں میں جمعہ یوم تعطیل ہے۔ صرف کھانے پینے کی دوکانوں کو کھلے رہنے کی اجازت ہے۔

اسی طرح جو ترک کی رعایا نہ ہو وہ بنکوں اور دفاتر میں بحکم حکومت جمہوری نوکر نہیں رکھا جا سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر جگہ جہاں اول مسلمانوں کا نام نہ تھا ہر دفتر میں ہر بنک میں ایک معقول تعداد ترک مسلمانوں کی نظر آتی ہے۔

اور یہ تو دنیا جانتی ہے کہ معاہدہ لوزان کی رو سے یونان کی مسلمان آبادی ٹرکی میں لائی جا رہی ہے اور ٹرکی کے یونانی باشندے جو ٹرکی کی رعایا تھے لاکھوں کی تعداد میں یونان بھیجے جا رہے ہیں مسلمان۔ مہاجرین ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ٹرکی میں آرہے ہیں اور اسی تعداد میں غیر مسلم عناصر کم ہو رہے ہیں اور اس واقعہ سے ملک کی زندگی میں جو تغیر عظیم پیدا ہو رہا ہے اس کا اندازہ مشکل ہے۔

صحّت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	رفیقاں	رفتگاں	۳۳	۳۴	مہمہ	مہمہ
۸	۱۰	—	؟	۳۴	۱	محظوطیت	محظوظیت
۱۶	۷	ہوتا اس	ہوتا۔ اس	〃	۳	تبدہات	تبدلات
۲۰	۱۰	لاکر	لگاکر	۳۴	۶	ہوتا ہے ابھی	ہوتا ہے۔ ابھی
۲۳	۱۳	چونچال	چونچال،	۴۱	۲	ہوتیں	ہوسکے
۲۴	〃	ہوجانے پر	جانے پر	۴۷	۱	پھلستا	پھسلتا
۲۵	۴	قیمت	قسمت	۵۱	۲	ہیں،	ہیں۔
〃	۱۱	خوشبوؤ	خوشبو	〃	۴	ہوئی	ہوتی
〃	۱۲	اتنی	اتنا	۶۴	۱	یاحودا	یاحودا
۲۷	۱	حسن	حِس	۶۷	۱۵	ہمدرد	ہمدرد
〃	۸	حُسن	حِسّ	۶۹	۴	ملبّس	ملبّس
۲۸	۹	اس کی فتنہ زا	اس کا فتنہ زا	۷۷	۸	متبسانہ	متبسمانہ
۳۳	۳	ہے اس کو	ہے۔ اس کو	۸۵	۷	واقعہ دے کر	واقعہ کا رنگ دے کر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱۳	۴	شے زیادہ	شے سے زیادہ	۲۰۸	۷	کوکب	نکوکب
۱۶۴	۶	بڑا	بُرا	۲۱۰	۲	اوررفاہیت	اور رفاہیت
۱۸۶	۳	جنبش نہ	جنبش	〃	۴	رذالت،	رذالت اور
۱۸۸	۱۳	محموریت	مخموریت	〃	〃	سنیل	سفیل
۱۸۹	۲	چھوکہ	چھوکر	۲۱۴	۸	نازیتی	نمازیتی
〃	۳	تیتری، کہ	تیتری،	۲۲۲	۱۳	اوروطن	مادر وطن
۱۸۹	۹	گاڑ ہے	گاڑے	۲۲۳	۱۴	شرگیں	شرگیں
۱۹۵	۶	بے حمیت	بے حمیتی	۲۲۵	۶	متحس	متجسس
۱۹۶	۱	حساس	احساس	۲۲۶	۴	پنہائے	پہنائے
〃	۵	تیہج	متہیج	۲۲۸	۶	کام	گام
۱۹۷	۴	نہیں	تھیں	〃	۱۱	اور!	او!
۱۹۹	۱۰	فرشتہ	فرشتہ[1]	〃	۱۲	ہائنز نشائن	ہائنز نشائن
		[1] فٹ نوٹ	ایک خوش الحان لڑکے نے قرآن مجید کا اک رکوع تلاوت کیا تھا	۲۲۹	۲	پرستان	پرستاران
				〃	〃	میں سے	میں سے ہم
۲۰۶	۴	انشام	آشام				

زہرا

یہ بھی ایک ترکی ناول کا ترجمہ ہے اور ترکوں کی معاشرت کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ قیمت - - - - - - - - - - - ۸ر (طبع ثانی)

جلال الدین خوارزم شاہ

یہ ترکی زبان کے سب سے زیادہ مشہور ادیب نامق کمال بے کے ایک عدیم المثال تاریخی ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ ڈرامے کا زمانہ وہ پُر آشوب عہد ہے جب کہ چنگیز خاں ایک بلائے مبرم کی طرح دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کر رہا تھا۔ ایک غیور و باحمیت بادشاہ، جلال الدین اسلام کے لئے اس فتنۂ محشر کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوتا ہے۔ ڈرامے کا ہر صفحہ، ہر سطر، عشق اسلام، محبتِ وطن، الفت ملت کے جذبات عالیہ سے لبریز ہے طرزِ بیان کے لئے اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ترکی ادب کی سحر طرازی کا بہترین نمونہ ہے۔ کتاب چھپ کر تیار ہے۔

قیمت - - - - - - - - - - - - - عصر / ۱۲

حکایات و احتسامات

یہ کتاب سید سجاد حیدر صاحب کے مختصر افسانوں اور مضامین

کا دوسرا مجموعہ ہے یعنی اسے "خیالستان" حصہ دوم سمجھنا چاہیے

تعداد صفحات ۲۲۶ - - - - - - قیمت عہ

ملنے کا پتہ

سید سجاد حیدر صاحب بی اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

منیجر صاحب مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڑھ

دار الاشاعت پنجاب - ۱۹۵ ریلوے روڈ لاہور

شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور